فردوسِ تخیل ز،خ،ش مرحومہ تقطیع بڑی ضخامت ۳۸۲ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد ۳/ پتہ دار الاشاعت پنجاب لاہور،

آج سے پندرہ بیس سال پہلے کی ادبی دنیا میں ز،خ،ش یعنی زاہدہ خاتون شروانیہ مرحومہ بنت نواب فضل اللہ خان مرحوم کو بڑی شہرت حاصل تھی، آج بھی یہ نام نامانوس نہیں ہی، مرحومہ تعلیم یافتہ مسلمان خاتون کا قابلِ فخر نمونہ تھین، ان کی ذات اعلیٰ تعلیم کے ساتھ تمام لوازمِ شرافت سے آراستہ تھی، ان کا شعری وادبی ذوق اچھے سے اچھے مرد ادیبون اور شاعرون سے کم نہ تھا، ایک زمانہ مین دنیائے شاعری ان کے ترانون سے گونج رہی تھی، مرحومہ نے اپنی زندگی ہی مین اپنے کلام کا ایک حصہ جو منظومات پر مشتمل ہے، مرتب کر لیا تھا، جسکی اشاعت کی نوبت ان کی وفات کے بیس سال بعد اب آئی ہے، اس مجموعہ مین تاریخی، مذہبی، قومی، سیاسی، اصلاحی مختلف موضوعون پر ۱۱۲ نظمین ہین، یہ نظمین جذبات وخیالات اور زبان وادب دونون حیثیتون سے اردو کے کسی بلند پایہ کلام سے کم نہین، ان سے مرحومہ کے ادبی ذوق کے ساتھ ان کی علمی استعداد، وسعتِ معلومات، حالاتِ زمانہ سے واقفیت، اور مذہبی وقومی جذبات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے، افسوس یہ ہے کہ مرحومہ کا انتقال عین عالم شباب یعنی کل ۲۰ سال کی عمر مین ہو گیا، ورنہ عمر اور مشق وممارست کی پختگی کے ساتھ ساتھ ان کا کلام بہت اونچا جاتا، آج کل تعلیم یافتہ مسلمان خواتین کی کمی نہین، بلکہ ان کی ترقی چشم بد دور روز افزون ہے، ان مین شاعرہ بھی ہین، اور ادیبہ بھی، اور ایسی رنگین نوا کہ ان کی رنگینی پر داغ کی شوخی بھی شرما جائے، لیکن کاش ان مین سے ایک مثال بھی ایسی نکل سکتی، جو علمی کمالات اور نسوانی اوصاف مین نہ سہی، کم از کم ادبی ذوق ہی مین ز،خ،ش کا ناتمام نمونہ پیش کر سکتی،

"م"

"جلد ۵۰" ماہ رجب المرجب ۱۳۶۱ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۴۲ء "عدد ۲"

مضامین

شذرات

الحمد للہ کہ اب دار المصنفین کی آبادی شروع ہوگئی ہے، رفقاء اور مولانا مسعود علی صاحب واپس آچکے ہیں اوسط اگست تک خاکسار کی بھی وطن سے واپسی ہوجائے گی، حیاتِ شبلی کی ملتوی شدہ چھپائی کا کام اجرا پائے گا، اور تالیف وتصنیف کے دوسرے سلسلے بھی جاری ہوں گے،

اس دوران مین احباب کے بہت سے خطوط کے جواب مین خاکسار سے تعویق وتاخیر ہوئی جس کا افسوس ہے لیکن اس ہیچمدان کی تنہائی اور بعض ذاتی افکار ومشاغل کو خیال میں رکھکر امید ہے کہ احباب میری فروگذاشت کو معاف فرمائیں گے،

جولائی کے اواخر مین پٹنہ میں بہار اردو کانفرنس کا اجلاس ہوا خطبے ہوے، تقریرین ہوئین، پیغام پڑھے گئے، تجویزین منظور ہوئین، اور ہندوستانی زبان کی تحریک کے حسن وقبح پر معرکہ آرائیاں بھی رہین، خوشی اس کی ہے کہ اس صوبہ کے حامیانِ اردو اور شائقینِ ادب نے "نشستند وگفتند" کے فریضہ کا احساس توکیا، عمل کا قدم تو اس کے بعد اٹھیگا،
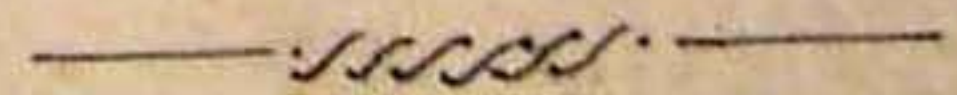
اس مین کوئی شبہہ نہیں کہ بیس پچیس برس کے اندر اس صوبہ کے تعلیم یافتون مین اپنی زبان کی اشاعت

اصلاح اور صحت کے خیال نے بڑی ترقی پائی ہے، اور ذوق ادب کا وہ ہنر جس کا دعویٰ پہلے صرف خواص کو تھا اب وہ عام ہے، لیکن یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ کسی صوبہ میں اس کی زبان کی ترقی کا اندازہ اس صوبہ کے منشورات اور مطبوعات ہی سے کیا جاسکتا ہے، اب غور کرنا چاہئے کہ اس صوبہ میں اخبار اور رسالے اور کتابین سال میں کتنی چھپتی ہیں اور کتنی بکتی ہیں، اس دوڑ میں اگر اردو کے حامی یہاں پیچھے ہیں، تو صرف زبانی دعویٰ زبان کی ترقی کو کسی صوبہ مین آگے نہیں بڑھا سکتا ہے،

اس جنگ نے ریڈیو کی شکل میں دنیا کی زبانون میں برق کی سی رفتار پیدا کردی ہے، برلن، لندن، اٹلی، جاپان، ٹرکی، مصر اور خدا جانے کن کن ملکوں سے اردو یا ہندوستانی زبان مین خبروں اور تقریروں کی اشاعت ہر روز ہوتی رہتی ہے، اور اس کی موجِ آواز فضائے عالم میں پھیل کر خدا جانے کہاں کہاں پہنچتی ہے، جاپان کو چھوڑ کر باقی ملکوں سے سلیس زبان میں خبریں اور تقریریں پھیلائی جاتی ہیں، اور اپنی اپنی زبان کے باوجود اسی زبان میں ہوتی ہیں جس کے اندر اشاعت کی قدرتی صلاحیت موجود ہے، اور یہ طبعی دلیل اس زبان کے مستقبل کے دعوی کے لئے ناقابل تردید ہی،

اس عالمگیر انتشار وپریشانی خاطر کے دور میں بعض ایسے خادمانِ علم ہیں جو اطمینان کے ساتھ زمانہ کے حالات سے بے پرواہو کر علمی خدمات میں مصروف ہیں، چنانچہ ایک دوست کی اطلاع ہے کہ مصر سے مشرقی علوم کے بعض شائق حکیم ابوریحان بیرونی کی کتاب الصیدلہ کی اشاعت کی کوشش میں مصروف ہیں، اس کا عربی متن جو بروصہ واقع ٹرکی سے ملا ہے، اس میں جابجا بیاض پائے جاتے ہیں، مقابلہ اور تصحیح کے لئے اس کے دوسرے نسخوں کی تلاش ہے، اصل عربی نہ ہو تو اس کے فارسی ہی نسخہ ملیں، اسی سلسلہ میں ہندوستان کے اہل علم سے بھی اس کے متعلق استفسار ہے، اگر ہمارے

ناظرین میں سے کسی کو اس کا پتہ معلوم ہو تو دریغ نہ فرمائیں،

صوبۂ متحدہ کے تعلیمی محکمہ نے اپنی ہندوستانی ایکاڈیمی کی رکنیت کے لئے دار المصنفین سے ایک رکن کی نامزدگی کی خواہش کی ہے، یہ سرکاری مراسلہ صدر نشین کے نام ہے، امید ہے کہ دار المصنفین کے صدر نشین نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی دار المصنفین کی طرف سے کسی رکن کو نامزد فرمائیں،

جنگی ضرورتوں نے ریلوے پارسلوں پر جو پابندیاں عائد کی ہیں اس سے تجارتی اشیاء کی آمد و رفت کی راہ میں جو دقتیں پیدا ہوگئی ہیں اس سے کتابوں کے خرید و فروخت پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے، اس حالت سے دار المصنفین کے شعبۂ اشاعت کا متاثر ہونا بھی ناگزیر ہے، اور نہیں کہا جا سکتا ہے کہ دار المصنفین کی مالی حالت پر اس کے جو اثرات پڑیں گے وہ کہاں تک اس کے لئے قابل برداشت ہو سکیں گے، ضرورت ہے کہ ہمارے احباب ڈاک کے ذریعہ سے کتابوں کے طلب کرنے کے سلسلہ کو وسعت دیں، تاکہ ان کا یہ ادارہ اپنی زندگی کے ان مشکل دنوں کو کسی طرح کاٹ سکے،

مقالات

اوصافِ نبوّت

اور

قرآنِ مجید

(وصف شہید یا شاہد)

از مولنٰنا عبد السلام ندوی

قرآن مجید میں پیغمبروں کے جو پیغمبرانہ اوصاف مذکور ہیں، ان میں ایک وصف شہید یا شاہد ہے، جس کے معنی قرآن مجید کے ترجموں اور عام تفسیروں میں گواہ کے لئے گئے ہیں، اور پیغمبروں کی اس گواہی کی مختلف توجیہیں کی گئی ہیں، اس مضمون میں پیغمبروں کے تمام پیغمبرانہ اعمال و فرائض کو پیش نظر رکھکر اس پر غور کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس لفظ کے کوئی دوسرے معنی بھی ہو سکتے ہیں یا نہیں؟

یہ ایک ایسا وصف ہے، جو پیغمبروں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ تمام روحانی ہستیوں کو شامل ہے، چنانچہ خداوند تعالیٰ کا یہ خاص وصف ہے، اور قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں آیا ہے، مثلاً اَنْتَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَهِیْد، وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَهِیْد، قرآن مجید کے ایک پرانے مستند ترجمہ میں پہلی آیت کا یہ ترجمہ کیا گیا ہے، "اور تو اوپر ہر چیز کے گواہ ہے" اور دوسری آیت کا اس سے مختلف یہ ترجمہ ہے، "وہ اوپر ہر چیز کے حاضر ہے"

خداوند تعالیٰ کے بعد یہ وصف ان فرشتوں کا ہے جن کو خداوند تعالیٰ نے اعمالِ انسانی کی نگرانی کے لئے مقرر فرمایا ہے،

وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ (ق-۲)

اور ہر شخص (اعمال کی جواب دہی کے لئے) حاضر ہوگا، (ایک فرشتہ تو) اس کے ساتھ ہانکنے والا ہوگا، اور ایک فرشتہ اس کا اعمال نامہ لئے ہوئے اُسکے عملوں کا گواہ"

اس آیت میں شہید کا ترجمہ گواہ کے لفظ سے قرآن مجید کے ایک جدید اور مقبول ترجمہ میں کیا گیا ہے،

خدا اور فرشتوں کے بعد تیسری روحانی ہستی پیغمبروں کی ہے، اور یہ وصف ان کے لئے قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں آیا ہے، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود فرماتے ہیں، وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ (مائدہ-۱۶) اور قرآن مجید کے ایک پرانے مستند ترجمہ میں اس کا یہ ترجمہ کیا گیا ہے "اور تھا میں اوپر ان کے شاہد جب تک رہا میں بیچ ان کے" شاہد عربی لفظ ہے اور تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ شہید ہی کا ہم معنی ہے، اس لئے ٹھیٹھ ترجمہ نہیں،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد سب سے زیادہ قرآن مجید میں یہ وصف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آیا ہے

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا، (بقرہ-۱۷)

اور (مسلمانو!) جیسے ہم نے تم کو اب ٹھیک قبلہ بتادیا ہے اسی طرح ہم نے تم کو بیچ کی راس کی امت (بھی) بنایا ہے، تاکہ اور لوگوں کے مقابلہ میں تم گواہ رہو اور تمہارے مقابلہ میں (تمہارے) رسول (محمد) گواہ رہیں،

لفظ شہید کے علاوہ آپ کا یہ وصف متعدد آیتوں میں لفظ شاہد کے ساتھ آیا ہے، جو لفظ شہید کے ہم معنی ہے، صرف فرق یہ ہے کہ لفظ شہید مبالغہ کا صیغہ ہے، اور شاہد مبالغہ کا صیغہ نہیں، جس طرح عالم سے مبالغہ کا صیغہ علیم ہے، اسی طرح شاہد سے مبالغہ کا صیغہ شہید ہے، اس لئے جو شخص شہید یا علیم ہوگا

وہ لازمی طور پر شاہد یا عالم ہے، بہر حال قرآن مجید میں آپ کا یہ وصف شاہد کے لفظ کے ساتھ متعدد آیتوں میں آیا ہے،

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا، (الاحزاب-۶)

اے پیغمبر! ہم نے تم کو گواہی دینے والا اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے،

یہی آیت سورۂ فتح میں بھی ہے، اور امام رازی نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ

قال المفسرون شاهدا على امتك بما يفعلون كما قال تعالى وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا،

مفسرین کا بیان ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ تمہاری امت جو کچھ کرتی ہے تم اس کے گواہ ہو، جیسا کہ خدا تعالیٰ نے اس آیت وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا میں اسی مضمون کو بیان فرمایا ہے،

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شاہد اور شہید دونوں ایک ہی معنی پر دلالت کرتے ہیں،

سورۂ مزمل میں آپ کے تمام اوصاف میں صرف شاہد کا وصف جیسا کہ آگے آئیگا بیان کیا گیا ہے، یعنی آپ کی صرف ایک پیغمبرانہ حیثیت کو نمایاں کیا گیا ہے،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ یہ تمام پیغمبروں کا مشترک وصف ہے، چنانچہ خود قرآن مجید میں ہے،

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا، (نساء-۶)

بھلا تو اس دن ان لوگوں کا کیا حال ہوتا ہے جب سب لوگ جمع ہوں اور ہم ہر امت کے گواہ (یعنی رسول) کو طلب کریں (جو ان کی نسبت گواہی دے) اور اے پیغمبر ہم تم کو بھی طلب کریں کہ (اپنی امت کے) لوگوں کی نسبت گواہی دیں،

لسان العرب میں جہاں مادہ "شہد" پر بحث کی ہے، لکھا ہے کہ "کل نبی شہید امتہ" یعنی ہر پیغمبر اپنی امت کا شہید ہوتا ہے،

پیغمبروں کے بعد خدا کے نیک بندوں کا بھی یہ وصف قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں مذکور ہے، ایک تو سورۂ بقرہ کی اس آیت میں جو اوپر گذر چکی ہے، اور وہ امت محمدیہ کے ساتھ مخصوص ہے، دوسرے اہل کتاب کا ذکر بھی اسی وصف کے ساتھ سورۂ آل عمران کی اس آیت میں آیا ہے،

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ تَبْغُونَهَا عِوَجًا وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ،

(اے پیغمبران سے) کہو کہ اے اہل کتاب دیدہ و دانستہ اللہ کے رستے میں (ناحق کی) کجی نکال نکال کر ایمان لانے والوں کو اس سے کیوں روکتے ہو،

اور قرآن مجید کے اس جدید و مقبول ترجمہ میں "انتم شہداء" کا ترجمہ بجائے گواہ کے "دیدہ و دانستہ" کے لفظ سے کیا گیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ خود مترجمین قرآن کے نزدیک اس لفظ کے اور معنی بھی ہوسکتے ہیں،

اب جو وصف خدا، خدا کے فرشتوں، خدا کے برگزیدہ پیغمبروں اور خدا کے نیک بندوں میں مشترک طور پر پایا جاتا ہے، وہ جس قدر اہم اور جس قدر ذمہ دارانہ ہے اس کا اندازہ صحیح بخاری کی اس روایت سے ہوسکتا ہو کہ جب ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے یہ آیت "فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هَؤُلَاءِ شَهِيدًا" پڑھوا کر سنی تو آپ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے، اس لئے ایسے اہم اور ذمہ دارانہ وصف کی تفسیر بھی اسی اہمیت اور ذمہ داری کے ساتھ ہونی چاہئے، جس کا بہت کم مترجمین نے خیال رکھا ہے، تفسیروں سے اس کے معنی پر کچھ روشنی پڑتی ہے، لیکن اس سے بھی اس کی پوری وضاحت نہیں ہوتی،

امام رازیؒ "وَأَنْتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

فالشهيد الشاهد ويجوز حمله على الرؤية ويجوز حمله على العلم ويجوز حمله على الكلام بمعنى الشهادة،

شہید کے معنی شاہد کے ہیں اور اس کے معنی دیکھنے کے بھی ہوسکتے ہیں، جاننے کے بھی ہوسکتے ہیں اور گواہی دینے کے معنی میں کلام کے بھی ہوسکتے ہیں،

لیکن ان احتمالات میں اصل حقیقت گم ہو کر رہ گئی،

دوسری جگہ "اذا جئنا من کل امة بشهيد الخ" کی تفسیر میں پہلے تو یہ روایت نقل کی ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے فرمایا کہ مجھ کو قرآن پڑھ کر سناؤ، انھوں نے سورۂ نساء کی تلاوت شروع کی، اور اس آیت پر پہنچے تو آپ رو پڑے، اس کے بعد سدی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اور پیغمبروں کے تبلیغ کی شہادت دے گی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کی تصدیق کی شہادت دیں گے، اسی لئے خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے، "وجعلناكم امة وسطا لتكونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدًا"، لیکن یہ صرف سدی ہی کا قول نہیں ہے، بلکہ خود صحیح بخاری میں یہ روایت مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن حضرت نوح علیہ السلام طلب کئے جائیں گے اور وہ حاضر ہوں گے تو خداوند تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا تم نے تبلیغ رسالت کی، وہ کہیں گے "ہاں" اب ان کی امت سے سوال کیا جائے گا، کہ کیا انھوں نے تبلیغ کی؟ وہ کہیگی کہ ہمارے یہاں کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، اب خداوند تعالیٰ حضرت نوح علیہ السلام سے کہیگا کہ تمہارے حق میں شہادت کون دیگا؟ وہ کہیں گے کہ "محمد اور ان کی امت" اب امت محمدیہ شہادت دیگی کہ انھوں نے تبلیغ رسالت کی، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی، "وکذلک جعلناكم امة وسطا لتكونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدًا" اور وسط کے معنی عدل کے بتائے،

اسی روایت کی بنیاد پر مفسرین نے شہید کے معنی ہر جگہ گواہ کے لئے ہیں، لیکن اگر ہر جگہ

شہید یا شاہد کے معنی گواہ کے لئے جائیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے اس قول کے "وکُنتُ عَلَیھِم شَھِیدًا مَّادُمتُ فِیھِم" کیا معنی ہوں گے؟ ان کی نسبت تو کسی روایت میں نہیں آیا ہے کہ وہ قیامت کے دن اپنی امت کے متعلق کوئی شہادت دیں گے، بلکہ اس آیت سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شہادت ان کی دنیوی زندگی ہی تک محدود تھی، قرآن مجید کی اس آیت "وَجاءت کلّ نفس معھا سائق وّشھید" میں شہید کے معنی ان فرشتوں کے ہیں جو لوگوں کے اعمال کی نگرانی کرتے ہیں، حالانکہ یہ کسی روایت سے ثابت نہیں ہے، کہ یہ فرشتے قیامت کے دن خدا کے سامنے لوگوں کے اعمال کی گواہی دیں گے،

اصل یہ ہے کہ لغت میں شہادت کے معنی حاضر ہونے کے ہیں، چنانچہ راغب اصفہانی کی مفردات القرآن میں ہے کہ شہود اور شہادت کے معنی حاضر ہونے کے ہیں، خواہ یہ حاضری ظاہری آنکھ کے مشاہدہ سے ہو یا دل کی آنکھ یعنی بصیرت کے مشاہدہ سے ہو، کبھی کبھی یہ لفظ صرف حاضر ہونے کے معنی میں آتا ہے، یعنی مشاہدہ عینی اور مشاہدہ قلبی اس میں داخل نہیں ہوتا مثلاً "عالم الغیب والشھادۃ" میں شہادت کے معنی صرف حضور کے ہیں، البتہ اگر اس معنی میں شہود کا لفظ اور مشاہدہ عینی اور مشاہدہ قلبی کے معنی میں شہادت کا لفظ لایا جائے تو بہتر ہو قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے، مثلاً

وَھُم عَلٰی مَا یَفعَلُونَ بِالمُؤمِنِینَ شُھُود (بروج-۱)

اور وہ اوپر اس چیز کے کہ کرتے تھے، ساتھ مسلمانوں کے حاضر تھے،

یہ ایک قدیم مستند ترجمہ ہے، ایک جدید ترجمہ قرآن میں اس کا ترجمہ یہ کیا ہے،" اور جو (ظلم وستم) مسلمانوں پر کر رہے تھے وہ (اس کا تماشہ) دیکھ رہے تھے"، اور تفسیر کبیر میں اس ظالمانہ موقع پر ان کے حاضر رہنے یا تماشہ دیکھنے کی متعدد وجہیں بتائی ہیں، جن میں ایک وجہ یہ ہے کہ وہ

اس قدر سنگدل تھے کہ ان کو اس بے رحمانہ تماشے کے دیکھنے میں لطف آتا تھا، لیکن اس کے ایک معنی گواہی دینے کے بھی ہو سکتے ہیں، یعنی جب بادشاہ نے ان کو مسلمانوں کے جلانے پر متعین کیا تھا، یہ لوگ اس کے سامنے گواہی دینے کے لئے اس موقع پر حاضر ہوئے تھے کہ تعمیل حکم میں کوئی کوتاہی نہیں کی گئی، لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان دونوں معنی میں کوئی تضاد نہیں، ایک شخص کسی مجلس میں تماشائی کی حیثیت سے شریک بھی ہو سکتا ہے اور ایک عدالت میں اس کے متعلق شہادت بھی دے سکتا ہے،

ایک دوسری آیت جس میں یہ لفظ حاضری کے معنی میں آیا ہے، یہ ہے،

ذَرنِی وَمَن خَلَقتُ وَحِیدًا وَّجَعَلتُ لَہٗ مَالًا مَّمدُودًا وَّبَنِینَ شُھُودًا، (مدثر-۱)

(اے پیغمبر) ہم کو اور (اس نابکار) کو (اپنے اپنے حال پر) رہنے دو (کہ ہم اس سے نپٹ لیں گے) جسے ہم نے اکیلا (یعنی بے سامان محض) پیدا کیا اور (پھر) اس کو بہت سامال عنایت کیا اور (مال کے علاوہ) بیٹے دیئے جو اس کے ساتھ حاضر رہتے ہیں،

تفسیر کبیر میں بیٹوں کے موجود اور حاضر رہنے کی دو وجہیں بتائی ہیں، ایک تو یہ کہ اس کے بیٹے دولت مند تھے، اس لیے طلب معاش کے لئے اس سے جدا نہیں ہوتے تھے، اور وہ ان کو اپنے ساتھ دیکھ کر خوش ہوتا تھا، یا یہ کہ وہ اس کے ساتھ مجلسوں اور محفلوں میں شریک ہوتے تھے،

یہ تو اس لفظ کے حقیقی معنی ہیں، اس کے علاوہ یہ لفظ اور بھی بہت سے مجازی معنوں میں استعمال ہوتا ہے، جن میں ہر جگہ حضوری کے معنی پائے جاتے ہیں، شاہد یا شہید یا شہود گواہ کو اس لیے کہتے ہیں کہ وہ واقعہ کے جائے وقوع پر حاضر اور موجود رہتا ہے، جو لوگ خدا کی راہ میں جان دیتے ہیں، ان کو شہید اس لیے کہتے ہیں کہ وہ درحقیقت زندہ ہیں، اس لئے ہم سے غائب نہیں بلکہ ہمیں میں حاضر اور موجود ہیں، یا یہ کہ ملائکہ رحمت ان کے پاس حاضر ہوتے ہیں، حامی اور مددگار کو بھی اس لئے شہید کہتے ہیں، کہ وہ مدد

کے وقت اور موقع پر جان و مال سے حاضر رہتے ہیں،

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فأتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شہداءکم من دون اللہ ان کنتم صدقین۔

(بقرہ -۳)

اور وہ جو ہم نے اپنے بندے (محمد) پر (قرآن) اتارا ہے اگر تم کو اس میں شک ہو (اور یہ سمجھتے ہو کہ یہ کتاب خدا کی نہیں بلکہ آدمی کی بنائی ہوئی ہے) اور (اپنے اس دعوی میں) سچے ہو تو اسی جیسی ایک سورت (تم بھی بنا) لاؤ اور اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو (بھی) بلالو،

اسی اصول کے مطابق نگراں کار کو بھی شہید یا شاہد کہتے ہیں، کیونکہ وہ جن لوگوں کی نگرانی کرتا ہے ان کے درمیان حاضر اور موجود رہتا ہے، اسی بنا پر خداوند تعالیٰ کو شہید یا شہود کہتے ہیں، کیونکہ اس سے بڑھ کر انسانی اعمال کا واقف کار اور نگراں کار کون ہو سکتا ہے؟

وَمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ۔

(یونس -۷)

اور (اے پیغمبر) تم کسی حال میں ہو اور قرآن کی کوئی سی آیت بھی (لوگوں کو) پڑھ کر سناتے اور (لوگو!) تم کوئی سا عمل بھی کرتے ہو ہم (ہمہ وقت) جب تم اس کام میں مشغول ہوتے ہو تم کو دیکھتے رہتے ہیں اور (اے پیغمبر) تمھارے پروردگار (کے علم) سے ذرہ بھر چیز بھی غائب نہیں رہ سکتی (نہ) زمین میں اور نہ آسمان میں اور ذرے سے چھوٹی چیز ہو یا بڑی (سب) کتاب روشن (یعنی لوح محفوظ) میں لکھی ہوئی (موجود) ہے،

انسانی اعمال کی نگرانی کے لئے خداوند تعالیٰ نے جن فرشتوں کو مقرر فرمایا ہے، ان کو بھی اسی معنی میں شہید کہتے ہیں، قرآن مجید کی ایک آیت یہ ہے،

واشرقت الارض بنور ربہا ووضع الکتب وجایء بالنبین والشہداء وقضی بینہم بالحق وہم لا یظلمون

(زمر -۷)

اور زمین اپنے پروردگار کے نور سے چمک اٹھےگی اور (لوگوں کے نامۂ اعمال کی) کتاب (لاکر سامنے) رکھ دی جائے گی، اور پیغمبر اور گواہ لا حاضر کئے جائیں گے اور (لوگوں) میں انصاف کے ساتھ (ان کے اختلافات کا) فیصلہ کر دیا جائیگا، اور ان پر کسی طرح کا ظلم نہ ہوگا،

لیکن اس آیت میں شہداء کا ترجمہ گواہ کے لفظ سے کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہاں شہداء سے مراد وہ فرشتے ہیں جن کو خداوند تعالیٰ نے اعمال انسانی کی نگرانی کے لئے متعین فرمایا ہے، چنانچہ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں کہ مقاتل کے نزدیک اس سے حفظہ یعنی اعمال انسانی کی نگرانی کرنے والے فرشتے مراد ہیں، اور اس آیت سے جیسا کہ اوپر گذر چکا،

وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ

(ق -۲)

اور ہر شخص (اعمال کی جواب دہی کے لئے) حاضر ہوگا (ایک فرشتہ تو) اس کے ساتھ ہانکنے والا ہوگا، اور (ایک فرشتہ اس کا اعمال نامہ لئے ہوئے اس کے عملوں کا) گواہ

اس کی تائید ہوتی ہے، اس لحاظ سے ان آیتوں میں شہداء اور شہید کا ترجمہ بجائے گواہ کے نگراں کار کے لفظ سے ہونا چاہئے،

فرشتوں کے بعد اعمال انسانی کی نگرانی پیغمبر کرتے ہیں، اس لئے ہر پیغمبر کو بھی شہید کہتے ہیں اور یہ کوئی قیاسی بات نہیں، بلکہ جس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے شہید کا لفظ آیا ہے، اس کی تفسیر تفسیر فتح البیان میں اس طرح کی گئی ہے،

ای حفیظا ورقیبا ادعی احوالہم وامنعہم عن مخالفۃ امرک،

یعنی میں انکا نگراں کار تھا، اور انکے حالات کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا اور تیرے حکم کی مخالفت سے انکو روکتا تھا،

یہ تفسیر درحقیقت زمخشری کی تفسیر کشاف سے ماخوذ ہے، جو مشہور ادیب تھے، اور ان کی تفسیر نے ادبی
حیثیت سے خاص طور پر شہرت حاصل کی ہے، وہ اس آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کرتے ہیں،

رقیبا امنعھم من ان یقولوا ذلک و یتدینوا بہ،	یعنی میں اُن کا نگہبان تھا اور ان کو یہ کہنے سے اور اس کو مذہب بنانے سے روکتا تھا،

اور اسی معنی میں قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق شاہد کا لفظ آیا ہے،
پیغمبر کے ساتھ ساتھ مومنین صادقین کا ایک گروہ بھی لوگوں کے اعمال کی نگرانی کرتا ہے،
اس لیے اس کو بھی اسی معنی میں شہید کا لقب ملا ہے، وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا
شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ میں یہی معنی مراد ہے،

اب نظام نبوت یا ایک پیغمبر کے پیغمبرانہ اعمال کی تکمیل چار قسم کے لوگوں کے اجتماع اور اشتراک
عمل سے ہوتی ہے، جن کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت میں ایک خاص ترتیب سے کیا گیا ہے،

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا، (نساء - ۹)	اور جو اللہ اور رسول کا کہا مانے تو ایسے لوگ (جنت میں) ان مقبول بندوں کے ساتھ رہیں گے، جن پر اللہ نے (بڑے بڑے) احسانات کئے ہیں، یعنی نبی اور صدیق اور شہید اور (دوسرے) نیک بندے اور یہ لوگ (کیا ہی) اچھے ساتھی ہیں،

اور امام رازی نے تفسیر کبیر میں ان کے معنی اور فرائض نہایت صحیح طور پر بتائے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:
"خداوند تعالیٰ نے پیغمبروں کا ذکر کیا، پھر تین اوصاف بیان کئے، یعنی صدیقین، شہداء اور
صالحین، اس پر تو اتفاق عام ہے کہ انبیاء، صدیقین، شہداء، اور صالحین سے مختلف ہیں،
لیکن ان تینوں اوصاف کے متعلق باہم اختلاف ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تینوں

اوصاف ایک ہی موصوف کے ہیں، کیونکہ ایک ہی شخص صدیق، شہید اور صالح ہو سکتا ہے،
لیکن دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ ہر وصف سے انسانوں کی ایک مستقل قسم مراد ہے، اور
یہی صحت سے قریب تر ہے، کیونکہ معطوف کا معطوف علیہ سے مختلف ہونا ضروری ہے،
جس طرح انبیاء ان لوگوں سے مختلف ہیں جن کا ذکر ان کے بعد کیا گیا ہے، اسی طرح صدیقین
کو ان لوگوں سے مختلف ہونا چاہئے، جن کا ذکر ان کے بعد کیا گیا ہے، یہی بات اور
اوصاف پر بھی صادق آتی ہے، اب ہم تینوں اوصاف کے متعلق بحث کرتے ہیں، ان میں
(۱) پہلا وصف تو صدیق کا ہے، اور صدیق اس شخص کو کہتے ہیں جو سچ بولنے کا عادی ہوتا ہے،
کیونکہ جس شخص پر عادۃً کسی فعل کا غلبہ ہو جاتا ہے، جب وہ اس فعل سے متصف کیا جاتا ہے تو
اس کے لئے فعیل کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے، جیسا کہ شراب کے سخت عادی کو سکیر، شریب اور خمیر کہتے ہیں،
ایمانداروں کے اوصاف میں سچائی ایک شریفانہ وصف ہے اور اس کی فضیلت کے
لئے صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ ایمان صرف تصدیق کا نام ہے اور جھوٹ کی برائی کے لئے
صرف اس قدر کہنا کافی ہے، کہ کفر صرف تکذیب کا نام ہے، جب تم کو یہ بات معلوم ہو چکی تو
ہم کہتے ہیں کہ مفسرین نے صدیق کے متعدد معنی بیان کئے ہیں،

ایک یہ کہ جو شخص بغیر کسی قسم کے شک و شبہہ کے پورے دین کی تصدیق کرے وہی صدیق
ہے، اور اس کی دلیل خداوند تعالیٰ کا یہ قول ہے،

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ،	اور جو لوگ خدا اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے وہی صدیق ہیں،

دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ صدیقین سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بزرگ ترین صحابہ مراد
ہیں، تیسرا قول یہ ہے کہ صدیق اس شخص کا نام ہے جس نے سب سے پہلے رسول اللہ علیہ وسلم کی تصدیق

کی اور اس میں تمام لوگوں کا پیشوا ہوا، غرض نبوت کے بعد علم وفضل میں اس وصفِ صدیقیت سے بڑا کوئی درجہ نہیں ہے، قرآن مجید بھی اسی پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ قرآن مجید نے صدیق اور نبی کا ذکر اس طریقہ سے کیا ہے، کہ ان کے درمیان میں کوئی واسطہ نہیں ہے، مثلاً وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذکر میں کہتا ہے، کہ وہ صادق الوعد تھے، اور حضرت ادریس علیہ السلام کا وصف قرآن مجید نے اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ صدیق نبی تھے، اور اس آیت میں کہا ہے مع النبیین والصدیقین یعنی اگر کوئی شخص صدیقیت کے درجہ سے ترقی کرے گا تو نبوت کے درجہ کو پہنچے گا، اور نبوت کے درجہ سے تنزل کرے گا تو صدیقیت کے درجہ کو پہنچے گا، کیونکہ ان کے درمیان میں کوئی واسطہ نہیں ہے،

(۲) دوسرا وصف شہادت کا ہے، لیکن شہید سے وہ شخص مراد نہیں ہے جس کو کسی کافر نے قتل کیا ہو، کیونکہ ایک تو اس آیت سے ثابت ہوتا ہو کہ شہادت ایک بہت بڑا دینی درجہ ہے، اور کافر کے ہاتھ سے قتل ہونا کوئی بہت بڑا شرف نہیں ہے، کیونکہ ایک بدکار شخص بھی کافر کے ہاتھ سے قتل ہو سکتا ہو،

اس بنا پر شہید وہ شخص ہے، جو خدا کے دین کی صحت کی شہادت کبھی دلیل سے، کبھی بیان سے، اور کبھی تیغ وسنان سے دے، اس لئے شہدا وہ لوگ ہیں جنھوں نے معیار عدل کو قائم کر رکھا ہے، اور یہ وہ لوگ ہیں جن کا ذکر خداوند تعالیٰ نے اس آیت میں کیا ہے،

شَہِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ وَالْمَلٰٓئِکَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ،

اللہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور فرشتے اور علم والے بھی (گواہی دیتے ہیں) اور نیز یہ کہ اللہ عدل (و) انصاف کیساتھ (کارخانۂ عالم کو) سنبھالے ہوئے (ہے)

جو شخص خدا کی راہ میں قتل کیا جاتا ہو اسکو بھی شہید اسی لئے کہتے ہیں کہ خدا کے دین کی حمایت میں اس نے اپنی جان کو ایک متاعِ حقیر سمجھا اور یہ شہادت دی کہ خدا ہی حق ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے باطل ہو، اور جو شخص اس معنی میں خدا کے شہدا میں سے ہوگا، وہ آخرت میں بھی خدا کے شہداء کے زمرے میں شامل ہوگا، جیسا کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے، "کذٰلک جعلنٰکم امة وسطا لتکونوا شھداء علی الناس!

شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:۔

صدیقیت اور محدثیت کی حقیقت یہ ہے کہ امت کے بعض افراد اصل فطرت کے رو سے پیغمبروں کے مشابہ ہوتے ہیں، جیسا کہ ایک ذہین شاگرد اپنے استاد کے مشابہ ہوتا ہو، اب اگر یہ مشابہت قوائے عقلیہ میں ہوتی ہے، تو اس کو صدیق یا محدث کہتے ہیں، لیکن جب یہ مشابہت قوت عملیہ میں ہوتی ہے، تو اس کو شہید یا حواری کہتے ہیں، اور خداوند تعالیٰ کے اس قول "والذین اٰمنوا باللہ ورسلہ اولٰٓئک ھم الصدیقون والشھدآء الخ میں ان ہی دونوں مقامات کی طرف اشارہ ہو،

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

مقاماتِ قلب میں دو مقام ایسے ہیں جو ان نفوس کے ساتھ مخصوص ہیں، جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں، اور وہ دونوں بمنزلہ صدیقیت اور محدثیت کے ہیں، البتہ صدیقیت اور محدثیت کا مرکز قوت عقلیہ ہے، اور ان دونوں کا مستقر اس عملی قوت میں ہے، جس کی لہریں قلب سے اٹھتی ہیں، اور یہ دونوں شہید اور حواری کے مقامات ہیں'

اب ان محققانہ تفسیروں کے رو سے شہادت کے معنی امر بالمعروف والنہی عن المنکر کے ہیں اور شہید اس شخص کو کہتے ہیں، جو نیکی کا حکم دے، اور برائی سے روکے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک

موقع پر فرمایا کہ یہ کیا بات ہے کہ تم لوگ ایک شخص کو دیکھتے ہو کہ وہ لوگوں کی آبروریزی کرتا ہے، اور اس کو روکتے نہیں، سب نے کہا کہ اس کی بدزبانی سے ڈرتے ہیں" فرمایا "تو ایسی حالت میں تم شہدا کے زمرے میں شامل نہیں ہوسکتے" اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ جس شخص نے برائی سے روکا اور خدا کے معاملہ میں لعنت وملامت سے نڈر رہا، وہ شہداء کے زمرے میں شامل ہے، (لسان العرب جلد ۴ ص ۲۲۹) بہرحال امر بالمعروف والنہی عن المنکر پیغمبروں کا اصلی فرض ہے، بالخصوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا امتیازی وصف یہی ہے، اور اسی امتیازی شان کے ساتھ قرآن مجید میں اس کا ذکر کیا گیا ہے،

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ

(ان سے ہماری مراد اس زمانہ کے وہ اہل کتاب تھے) جو ہمارے ان) رسول نبی امی (محمد) کی پیروی کرتے ہیں جن (کی بشارت) کو اپنے ہاں توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، وہ ان کو اچھے کام (کرنے) کو کہتے اور برے کام سے ان کو روکتے ہیں

(الاعراف - ۱۹)

اسی معنی میں قرآن مجید میں آپ کا ذکر کہیں شہید اور کہیں شاہد کے لقب سے کیا گیا ہے، اور جہاد جو آپ کی زندگی کا سب سے زیادہ مقدس فرض تھا، اسی امر بالمعروف والنہی عن المنکر کی ایک اعلیٰ ترین قسم تھا، چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ تم میں سے اگر کوئی شخص کسی برائی کو دیکھے تو اس کو ہاتھ سے مٹا دے، لیکن اگر اس کی قدرت نہیں رکھتا، تو اپنی زبان سے مٹائے، اگر اتنی بھی طاقت نہیں رکھتا تو دل سے اس کو برا سمجھے اور صرف دل سے برا سمجھنا ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے، لیکن آپ نے اپنی قوت ایمانی کے بل پر جہاد کے ذریعہ سے نہ صرف ایک یا دو شخص کی بلکہ دنیا کی عالمگیر برائیوں کو مٹایا، اسی بنا پر آپ کی نسبت ارشاد خداوندی ہے،

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ

(لوگو، جس طرح ہم نے فرعون کی طرف (موسیٰ کو)

كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ،

(مزمل - ۱)

پیغمبر (بناکر) بھیجا تھا، تمھاری طرف بھی (محمد کو) رسول (بناکر) بھیجا ہے جو (قیامت کے دن) تمھارے مقابلہ میں گواہی دیں گے،

اس آیت کے ترجمہ میں بریکٹ میں قیامت کے دن کا جو اضافہ کیا گیا ہے، وہ ایک غیر ضروری اضافہ ہے، کیونکہ آیت میں قیامت کے دن کا کوئی ذکر نہیں ہے، اس لئے لازمی طور پر شاہد کا ترجمہ گواہ سے کرنا بھی صحیح نہ ہوگا، کیونکہ یہ گواہی قیامت میں نہ ہوگی، بلکہ شاہد کا صحیح ترجمہ نگران کار یا دوسرے الفاظ میں امر بالمعروف والنہی عن المنکر کرنے والا ہوگا، اور ہم ابھی لکھ آئے ہیں کہ جہاد بھی امر بالمعروف والنہی عن المنکر ہی کی ایک قسم ہے، اس لئے شاہد مجاہد کو بھی کہہ سکتے ہیں، اور پیغمبروں میں صرف دو ہی پیغمبروں کی مجاہدانہ فوز و فلاح مذہبی تاریخ کا یادگار واقعہ ہے، ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام جن کی وجہ سے فرعون جیسا مغرور اور متمرد بادشاہ اپنے کیفر کردار کو پہنچا، دوسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کے ذریعہ سے خداوند تعالیٰ نے روسائے قریش کو جو کبر و غرور اور تمرد و عصیان میں فرعون ہی کے مشابہ تھے، برباد کیا، اور اس حیثیت سے آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کامل مشابہت پیدا ہوگئی، اس لئے خداوند تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صراحتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اور کنایۃً آپ کی قوم بالخصوص روسائے قریش کو فرعون کے ساتھ تشبیہ دی اور فرعون کے تمرد و عصیان کا جو نتیجہ ہوا اس کو نہایت تہدید آمیز الفاظ میں اس طرح بیان فرمایا،

فعصی فرعون الرسول فاخذنٰہ اخذا وبیلا ۔ (مزمل - ۱)

سو فرعون نے (ان) پیغمبر کی نافرمانی کی تو ہم نے اس کو بڑے وبال میں دھر پکڑا،

اور اس طریقہ سے کفار مکہ اور روسائے قریش کو در پردہ اسی سخت گرفت کی دھمکی دی، خود ہمارے مفسرین تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ایک تہدید آمیز آیت ہے، چنانچہ تفسیر کبیر میں ہے،

واعلم ان الخطاب لاھل مکۃ و المقصود تھدیدھم بالاخذ الوبیل

جاننا چاہئے کہ اس آیت کے مخاطب اہل مکہ ہیں اور خطاب کا مقصد ان کو سخت گرفت کی دھمکی

بہرحال شہادت اور امر بالمعروف والنہی عن المنکر دونوں ہم معنی ہیں، اور سب سے پہلے شہادت کا یہ درجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا، اور آپ کی تعلیم و تربیت اور آپ کے فیض صحبت سے آپ کی امت بالخصوص صحابۂ کرام کو یہ شرف حاصل ہوا جیسا کہ خداوند تعالیٰ خود اس شرف کو بیان فرماتا

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران - ۱۱۰)

لوگوں (کی رہنمائی) کے لئے جس قدر امتیں پیدا ہوئیں، ان میں تم (مسلمان) سب سے بہتر ہو کہ اچھے (کام کرنے) کو کہتے اور برے کاموں سے منع کرتے

خداوند تعالیٰ نے اسی مفہوم کو دوسری آیت میں خود لفظ شہادت سے بھی بیان فرمایا ہے

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۱

لیکن ہمارے مفسرین نے عموماً اس آیت میں اُمَّۃً وَّسَطًا کے معنی امت عادلہ کے لئے ہیں اور صحیح بخاری کی روایت میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی "وسطاً" کی تفسیر عادل کے لفظ سے فرمائی ہے، لیکن یہ اس کے مجازی معنی ہیں، ورنہ لغت میں وسط کے معنی کسی چیز کے درمیانی حصہ کے ہیں، اور چونکہ ہر چیز کا درمیانی حصہ اس کے دونوں کناروں سے بہتر ہوتا ہے اس لئے مجازاً وہ افضل اور بہتر کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے، اور اس حالت میں یہ لفظ اسم نہیں ہوتا، بلکہ صفت ہوتا ہے، چنانچہ لسان العرب میں ہے، (جلد ۹ ص ۳۰۶)

واعلم ان الوسط قد یاتی صفۃ وان کان اصلہ ان یکون اسما من

جاننا چاہئے کہ لفظ وسط اصولاً اگرچہ اسم ہے لیکن وہ اس حیثیت سے صفت کے معنی

جھۃ ان وسط الشیء افضلہ وخیارہ کوسط المرعی خیر من طرفیہ وکوسط الدابۃ للرکوب خیر من طرفیھا لتمکن الراکب ومنہ الحدیث خیار الامور اوساطھا فلما کان وسط الشیء افضلہ واعدلہ جاز ان یقع صفۃ وذلک فی مثل قولہ تعالیٰ وتقدس وکذلک جعلناکم امۃ وسطا ای عدلا،

بھی آتا ہے کہ ہر چیز کا وسط یعنی درمیانی حصہ اس کا بہترین حصہ ہوتا ہے جیسے چراگاہ کا درمیانی حصہ اس کے دونوں کناروں سے اچھا ہوتا ہے، اور سواری کا درمیانی حصہ سوار کے لئے اس کے دونوں کناروں سے بہتر ہوتا ہے، کیونکہ درمیانی حصہ میں سوار جم کر بیٹھ سکتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ تمام چیزوں کے بہترین حصے اس کے بیچ کے حصے ہوتے ہیں، پس جبکہ کسی چیز کا درمیانی حصہ اس کا بہترین اور موزوں حصہ ہوتا ہے، تو وہ صفت بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ خداوند تعالیٰ کے اس قول "وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا" میں یہ صفت بمعنی عدل آئی ہے،

اب جبکہ وسط کے معنی افضل اور بہتر کے، اور شہادت کے معنی امر بالمعروف والنہی عن المنکر کے قرار پائے، تو یہ آیت پہلی آیت یعنی كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ الخ کے ہم معنی و مرادف ہو گئی،

اور اب اس کا ترجمہ یہ ہوگا،

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۱

اور اسی طرح ہم نے تم کو بہترین امت بنایا تاکہ تم لوگ اور تمام آدمیوں کو امر بالمعروف والنہی عن المنکر کرو اور تمہارا پیغمبر (محمد) تم کو امر بالمعروف والنہی عن المنکر کرے،

چنانچہ امام رازی نے اس آیت کی تفسیر میں پہلے تو وسط کے معنی وہی عادل کے لئے ہیں، پھر اس کے دوسرے معنی افضل اور بہتر کے بتائے ہیں، اور لکھا ہے کہ

القول الثانی ان الوسط من کل شیی خیارہ قالوا وھذا التفسیر اولی من الاول لوجوہ،

دوسرا قول یہ ہے کہ ہر چیز کا وسط اس کا بہترین حصہ ہوتا ہے، اور مفسرین کہتے ہیں کہ یہ تفسیر پہلی تفسیر (یعنی وسط بمعنی عادل) سے متعدد وجوہ کی بنا پر بہتر ہے،

جن میں ایک وجہ یہ ہے کہ

انہ مطابق لقولہ تعالیٰ "كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ،

وہ خداوند تعالیٰ کے اس قول "كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" کے مطابق ہے،

اور یہ اس بات کی صاف دلیل ہے، کہ وہ دونوں آیتوں کو ہم معنی سمجھتے ہیں،

اس تفسیر کی روشنی میں شہید اور شاہد کے معنی کی جو تعیین و تشریح کی گئی ہے، وہ پیغمبرانہ فرائض سے بہت زیادہ مناسبت رکھتی ہے، اور جو شخص یا جو لوگ دنیا میں ان فرائض کو ادا کریں گے وہی قیامت کے دن اور لوگوں کے اعمال کے گواہ بھی ہوں گے، اس لئے حدیث و قرآن میں کوئی تعارض نہیں بلکہ تطابق ہے،

تفسیر ابو مسلم اصفہانی

عربی معتزلہ کی مفقود الخبر نادر الوجود عقلی تفسیر قرآن کے اجزا، جو نہایت دیدہ ریزی سے امام رازی کی تفسیر کبیر سے جمع کئے گئے ہیں، عمدہ ٹائپ میں چھپی ہے، قیمت:- ۸ر ضخامت ۱۰۳ صفحے،

"منیجر"

ابن جریر طبری

از

مولوی محمد اویس صاحب ندوی نگرامی رفیق دار المصنفین

تیسری صدی ہجری کے اوائل میں طبرستان کے مشہور شہر آمل کے ایک دولت مند گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا، رنگ گندمی، بدن نحیف و نزار، لیکن کسے خبر تھی کہ یہی جسم ناتوان ایک دن ایسے علوم و کمالات کا حامل ہوگا، جس کی نظیر ملنا مشکل ہو جائے گی، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تاریخ، نحو، ادب جس فن پر لب کشائی کریگا، معلوم ہوگا کہ یہ اسی کا فن ہے!

اس سے ہماری مراد، ابو جعفر محمد بن جریر الطبری کی ذات ہے،

ابن جریر طبری کو لوگ عموماً صرف ایک مورخ اور اس کے بعد ناقل روایت مفسر کی حیثیت سے جانتے ہیں، ان کے کمالات اور ان کی خصوصیات ابھی عموماً پردہ خفا میں ہیں، اس مضمون میں اجمالی طور سے انہی امور پر نظر مقصود ہے و باللہ التوفیق و علیہ التکلان،

نام و نسب اور ابتدائی زندگی محمد نام اور ابو جعفر کنیت ہے، خطیب (ج ۲ ص ۱۶۲) اور سبکی (طبقات شافعیہ ج ۲ ص ۱۳۵) کی روایت کے مطابق پورا نسب نامہ یہ ہے:

محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب الطبری،

ابن خلکان (ج ۲ ص ۳۳) کی روایت میں نسب نامہ یوں ہے:

ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید بن خالد الطبری،

کسی نے خود ابن جریر سے ان کا نسب دریافت کیا، انھوں نے جواب میں کہا، محمد بن جریر، سائل نے مزید تفصیل چاہی تو یہ شعر پڑھ دیا،

قد رفع العجاج ذکری فادعنی باسمی اذا الانساب طالت یکفنی[1]

سات سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا، ابھی بچپن کا زمانہ تھا کہ باپ نے خواب میں اپنے نور نظر کو بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر پایا، معبّر نے پورا خواب سنکر تعبیر دی کہ اگر یہ بچہ زندہ رہا، تو دین کا خادم اور شریعت کا زبردست حامی ہوگا[2]،

ابتدائی تعلیم اپنے وطن آمل ہی میں پائی، جب کچھ سنِ تمیز کو پہنچے تو والد بزرگوار نے حصول علم کے لئے سفر کی اجازت دی، چنانچہ آمل سے رے آئے، یہاں رے اور جوارِ رے کے مشائخ سے استفادہ کیا، اس کے بعد بصرہ، کوفہ، مصر، فسطاط اور شام کے سفر کئے اور ہر جگہ علماء و مشائخ سے نفع اُٹھایا،

ابن جریر کے زیادہ قابلِ ذکر اساتذہ کے نام یہ ہیں:

محمد بن حمید الرازی، مثنی بن ابراہیم الأبلی، احمد بن حماد الدولابی، محمد بن بشار، ہناد بن السری ۲۴۳ھ، ابو کریب محمد بن العلاء الہمدانی ۲۴۸ھ،

حصولِ علم میں محنت و جفاکشی کا یہ عالم تھا کہ رے کے زمانہ قیام میں رے اور جوار رے دونوں جگہ کے مشائخ سے بہ یک وقت استفادہ کرتے، احمد بن حماد دولابی جو اطراف رے میں رہتے تھے، ابن جریر ان کی مجلس میں شرکت کے لئے جاتے اور ختم درس کے بعد وہاں سے دوڑتے ہوئے رے آتے تاکہ یہاں کے مشائخ کے حلقۂ درس میں شریک ہو سکیں[3]،

ذہانت، توجہ اور محنت نے اساتذہ کی نظر میں محبوب بنا دیا تھا، چنانچہ کوفہ میں ایک بار اپنے استاد ابو کریب کے مکان پر دوسرے طالبانِ حدیث کے ساتھ گئے، استاد نے شاگردوں

کا امتحان لیا، اور چند سوالات کئے، ان سوالات کا پورا اور صحیح جواب دینے والا صرف ایک شاگرد تھا، ابن جریر! استاد خوش ہوگیا، اور اپنے حلقۂ درس میں اعزاز و اکرام کی جگہ دی[1]،

ایک عرصہ تک تحصیلِ علم اور کسبِ کمالات کے بعد ابن جریر اپنے وطن طبرستان واپس آئے لیکن قدرت کو یہاں ان کا قیام منظور نہ تھا، ان کو ایسے مرکز میں رہنا چاہئے تھا، جہاں سے علوم و معارف کی پوری تبلیغ ہو سکے،

ہوا یہ کہ طبرستان میں جب یہ داخل ہوئے تو دیکھا کہ یہاں رفض و تشیع کے دروغ کو خوب ہی فروغ ہے، اور حضرات صحابۂ کرام پر عموماً سب و شتم جاری ہے[2]،

اس موقع پر ابن جریر نے اپنے عالمانہ منصب کو محسوس کیا، اور حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے فضائل و مناقب بیان کرنا شروع کیا، انجام کار حکومتِ وقت مخالف ہوگئی، اور ان کو ترک وطن کرکے بغداد میں قیام کرنا پڑا[3]،

ساری عمر بغداد ہی میں علم و دین کی خدمت اور اعلائے کلمۃ حق میں بسر ہوئی، حکومت وقت نے بارہا چاہا کہ ان کی کچھ خدمت کرے لیکن ان کی غیور اور محتاط طبیعت نے کبھی اسکو قبول نہ کیا، خاقانی نے اپنے زمانہ وزارت میں کافی دولت نذر کرنا چاہی لیکن وہ ان کی بارگاہ میں قبول نہ ہوئی، قضا کا عہدہ پیش کیا، اس سے بھی انکار کر دیا، خیراندیشوں نے عرض کیا کہ یہ تو ثواب کا کام تھا، اسے آپ نے کیوں چھوڑ دیا؟ اس پر ابن جریر ان لوگوں سے ناخوش ہوئے اور فرمایا کہ مجھکو تو یہ توقع تھی کہ اگر میں اس عہدہ کو قبول کرتا تو تم مجھ کو اس سے باز رکھتے نہ کہ تم خود مجھ کو ترغیب دیتے ہو[4]؟

بغداد کے زمانہ قیام میں بعض اوقات ابن جریر کے لئے بہت سخت گذرے، رفض اور الحاد کا الزام لگایا گیا، یہ الزام لگانے والے وہ لوگ تھے، جن سے اگر رفض اور الحاد کے معنی دریافت

کئے جاتے تو وہ اس کو سمجھ بھی نہ سکتے[1]، حالانکہ ابن جریر نے رفض ہی کے فتنہ کی وجہ سے اپنے وطن طبرستان کو چھوڑا تھا، اور بغداد میں آکر پناہ لی تھی، بغداد میں حنابلہ نے بھی مخالفت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، ان کے اختلاف کا سبب یہ تھا کہ ابن جریر نے جب اپنی کتاب اختلاف الفقہاء تصنیف کی جس کا ذکر آگے آتا ہے، تو اس کتاب میں امام احمد بن حنبلؒ کا ذکر نہیں کیا، وہ کہتے تھے کہ امام احمد محدث ہیں فقیہ نہیں ہیں، بہرحال اسی چیز نے حنابلہ کو آتش زیرپا کر دیا[2]، ایک بار تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ ابن جریر کے مکان پر مخالفین کے ہزاروں آدمیوں نے ہجوم کیا، اور اس قدر خشت باری کی، کہ دروازہ پتھروں سے پٹ گیا، مجبوراً پولیس آئی اور اس نے فتنہ فرو کیا[3]،

یہ سب کچھ ہوا، لیکن اس سے ابن جریر کی عظمت، احترام اور ان کے تقدس میں کوئی فرق نہ آیا، اہل دولت کو یہی تمنا رہتی کہ کاش ابن جریر ان کا تحفہ قبول کرلیں اور اہل علم ابن جریر سے روایت کو باعث فخر سمجھتے،

ان کی عظمت و شان کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو مہینوں شب و روز قبر پر نماز جنازہ پڑھی جاتی رہی، اور صدہا اہل دین و ادب نے مرثیے کہے،

ان مرثیوں میں ابن سعید بن الاعرابی اور ابن درید کے مرثیے بہت دردناک ہیں،

ابن سعید بن الاعرابی کے مرثیہ کا ایک شعر ہے،

قام ناعی العلوم اجمع لما   قام ناعی محمد ابن جریر

ابن درید نے اپنے مرثیہ میں کہا

ان المنیۃ لم تتلف بہ رجلا   بل اتلفت علما للدین منصوبا

ان دونوں مرثیوں کو خطیب نے اپنی تاریخ میں نقل کر دیا ہے،

---

[1] تاریخ کامل ج ۸ ص ۹۹ [2] ایضاً [3] معجم الادباء ج ۶ ص ۴۳۶،

شنبہ کو دن کے آخری حصہ میں ان کا انتقال ہوا، اور یکشنبہ ۲۶ شوال ۳۱۰ھ کو بغداد میں دفن ہوئے، ابن خلکان کہتے ہیں کہ مصر میں ایک قبر ہے جو لوگوں کی زیارت گاہ ہے، اور اس پر لکھا ہوا ہے کہ یہ ابن جریر طبری کی قبر ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ ابن جریر صاحب تاریخ ہیں، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے ابن جریر بغداد ہی میں دفن ہوئے[1]،

ابن جریر کے علوم | اس میں کوئی شک نہیں کہ ابن جریر کا جسم بغداد میں زیر زمین دفن ہو گیا لیکن ابن جریر کے نام کو بغداد کی سرزمین نہ دبا سکی، ابن جریر کی اصل چیز ان کے علمی کارنامے ہیں خدا کا شکر ہے کہ ان کے کارناموں سے دنیا کسی حد تک واقف ہے اور ان کی معترف ہے،

ابن جریر علوم اسلامیہ کے بہت بڑے خادم اور مسلمانوں کے مخدوم ہیں، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تصوف، تاریخ، نحو، صرف، ادب، معانی، منطق، حساب، جبر و مقابلہ اور طب میں ان کو خاص کمال حاصل تھا،

ان کی انتیس تصنیفات میں سے ہمارے پاس صرف چھ مطبوعہ کتابیں موجود ہیں (۱) تفسیر ابن جریر (۲) تاریخ ابن جریر (۳) آثار الباقیہ عن القرون الخالیہ (۴) ذیل المذیل (۵) اختلاف الفقہاء (۶) الاعتقاد،

ایک کتاب تہذیب الآثار کے متعلق معلوم ہے کہ اس کے بعض حصے استنبول کے کتب خانہ میں موجود ہیں، بقیہ نوادر پردۂ خفا میں ہیں،

آئندہ صفحات میں ابن جریر کے انہی علوم اور انہی تصانیف کے اجمالی تعارف کی کوشش کی گئی ہے،

ابن جریر اور فن تجوید و قرأت | ابن جریر کے علوم اور تصانیف کو ہم قرآن پاک سے شروع کرتے ہیں،

---

[1] ابن خلکان ج ۲ ص ۲۳۲،

اس سلسلہ میں پہلا فن تجوید و قرأت کا آتا ہے، سات سال کی عمر میں ابن جریر نے قرآن حفظ کیا[1]
سلیمان بن عبد الرحمن بن حماد طلحی قرآن کے استاد تھے، جب تک خود اپنی قرأۃ نہ اختیار کی حمزہ
جن کا شمار شموس قراء میں ہے، ان کے طریق پر قرأت کرتے رہے، حمزہ سے انکے روایت کے دو سلسلے ہیں

(۱) طلحی عن خلاد عن سلیم بن عیسیٰ عن حمزہ،

(۲) عن یونس بن عبد الاعلیٰ عن علی بن کیسہ عن سلیم عن حمزہ،

یونس بن عبد الاعلی (م ۲۶۴ھ) ہی کے ذریعہ سے بہ واسطہ ورش نافع کی روایت بھی انکو
حاصل تھی،

قرآن اتنا اچھا پڑھتے تھے کہ دور دور کے قرا اس کے سننے کے لئے اور عام لوگ ان کے
پیچھے نماز پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے[2]

خطیب اپنی تاریخ (ج ۲ ص ۱۶۲) میں ابو علی طوماری کے ایک واقعہ کو نقل کرتے ہیں کہ ایک بار
رمضان کی کسی آخری شب میں ابو علی طوماری اپنے استاذ ابوبکر بن مجاہد کے ساتھ تراویح کیلئے
روشنی لئے ہوئے جا رہے تھے، ابن مجاہد چلتے چلتے محمد بن جریر طبری کی مسجد کے سامنے کھڑے ہو گئے،
طبری مسجد میں سورۂ رحمن پڑھ رہے تھے، دیر تک ان کی قرأت سنتے رہے، جب واپس لوٹے تو
ابو علی طوماری نے عرض کیا کہ آپ نے لوگوں کو اپنا منتظر رکھا، اور یہاں قرآن سنتے رہے،
ابوبکر بن مجاہد نے کہا کہ تمھیں کیا خبر کہ اللہ نے کیسا آدمی پیدا کیا ہے جو اسقدر اچھا قرآن پڑھتا ہے[3]

ابن جریر کو علم قرأت میں کامل دستگاہ حاصل تھی، اس میں انھوں نے امامت کا درجہ حاصل کیا تھا،
اور ان کا شمار ان لوگوں میں تھا جو مختلف قرأتوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دے سکتے تھے[4]

انھوں نے اپنی کتابوں میں قراء سبعہ سے مقدم وہ قرأت بیان کی ہیں جو صحابہ کرام کے عہد میں

---

[1] معجم الادبا، ج ۶ ص ۴۲۳ [2] تمام حوالے معجم الادبا ج ۶ کے ہیں [3] تبیان للجزائری ص ۹،

پڑھی جاتی تھیں اور جن سے وہ نماز پڑھتے تھے[1]

علم قرأت میں تصنیف

ابو علی الحسن بن علی الاہوازی (م ۴۴۶ھ) کہتے ہیں کہ میں نے فن قرأت میں ابن جریر
کی ایک کتاب آٹھ جلدوں میں دیکھی، اس میں انھوں نے تمام مشہور اور شاذ قرأت کو جمع کر دیا ہے
نیز ان سب میں اپنی پسندیدہ قرأتوں کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن اپنے اس اختیار و انتخاب میں وہ قرأت مشہورہ
سے الگ نہیں ہوئے[2]

یاقوت نے معجم الادبا میں ان کی ایک اور کتاب الفصل بین القرأت کا ذکر کیا ہے جس میں
ابن جریر نے حروف قرآن کے بارے میں قاریوں کے اختلافات کو واضح کیا ہے، نیز مکہ، مدینہ، کوفہ،
بصرہ اور شام وغیرہ کے قاریوں کی تفصیل اور ان کی قرأتوں کی توضیح کی ہے، اور ان میں سے جس کو
انھوں نے قابل ترجیح سمجھا ہے مع دلائل کے اس کا ذکر کیا ہے، ابوبکر بن مجاہد اس کتاب کیلئے
کہا کرتے تھے، کہ اس سلسلہ میں اس سے عمدہ کتاب نہیں لکھی گئی،

ابن جریر اور تفسیر

قبل اس کے کہ ہم ابن جریر کی تفسیر پر گفتگو کریں ضروری ہے کہ ان سے پیشتر کی
تاریخ تفسیر پر اجمالی نظر ڈال لیں تاکہ صحیح رائے قائم کرنے میں آسانی ہو،

ابن جریر سے پیشتر تفسیر کے تین دور قائم ہو سکتے ہیں،

(۱) پہلا دور حضرات صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کا ہے، جن کو بارگاہ نبوت
سے براہ راست فہم قرآن کا موقع ملا، ہر چند کہ حضرات صحابہ عموماً اہل عرب تھے اور انہی کی زبان
میں قرآن نازل ہوا تھا، تاہم یہ فہم قرآن میں اپنے کو رسول کا پابند اور محتاج سمجھتے تھے، کوئی
لفظ یا آیت ان بزرگوں کی سمجھ میں نہ آتی تو حضور سے دریافت فرماتے، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا
پیغمبرانہ وظیفہ تھا، کہ امت کے سامنے وحی الٰہی کی تشریح و تبیین فرمائیں، اسلئے بسا اوقات ایسا ہوتا

---

[1] شرح سبعہ قرأت از مولوی محی الاسلام صاحب پانی پتی ص ۲۶ [2] معجم الادبا ج ۶ ص ۴۲۷،

کہ خود سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کسی آیت کے متعلق صحابہؓ سے دریافت فرماتے اور بعد کو اسکی توضیح و تشریح فرما دیتے،

اس کے ماسوا اکابر صحابہ اپنی علمی مجلسوں میں بھی قرآن مجید کے متعلق بہت سے نکتے حل فرماتے، قرآن کے غریب الفاظ کی شرح میں دیوانِ عرب سے کام لیتے، احکامِ قرآن پر غور فرماتے، مسائل کا استنباط کرتے، شانِ نزول بیان فرماتے، اگر کسی کو غلط معانی اخذ کرتے یا بیان کرتے ہوئے دیکھتے تو اسکی اصلاح فرما دیتے تھے،

اس طرح سے قرآن پاک کا سب سے مستند اور صحیح تفسیری ذخیرہ ان بزرگوں کے سینہ میں محفوظ تھا، اس مبارک عہد میں اسرائیلیات تفسیری روایات میں دخل نہ پا سکیں، تاہم وہب بن منبہ اور کعب الاحبار کی روایات کا سلسلہ ضرور تھا، صحابہ کرام میں دس حضرات کو اس فن میں خاص امتیاز حاصل تھا، خلفاے راشدین، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، حضرت ابی بن کعبؓ ٣٠ھ، حضرت زید بن ثابتؓ ٤٥ھ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ ٤٤ھ، حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ،

ان حضرات کے سوا حضرت انسؓ ٩١ھ، حضرت ابو ہریرہؓ ٥٨ھ، حضرت ابن عمرؓ ٧٣ھ، حضرت جابرؓ ٧٨ھ، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ ٦٣ھ سے بھی تفسیری روایات مروی ہیں، مگر بہت کم، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ کی مرویات زیادہ تر قصص اور اخبار و فتن وغیرہ سے متعلق ہیں[1]،

خلفاے راشدین میں سب سے زیادہ تفسیری روایات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہیں، حضرت علیؓ کے بعد حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایات زیادہ ہیں، سب سے زیادہ تفسیری روایات حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی طرف منسوب ہیں،

---

[1] اتقان ج ۲ ص ۱۸۷،

عہدِ صحابہ میں ایک تفسیری مجموعہ کا انتساب حضرت ابی بن کعبؓ کی طرف ہے، اس سے ابن جریر طبری نے بکثرت اخذ کیا ہے، حاکم نے مستدرک میں نیز امام احمد بن حنبلؒ نے بھی اس سے اخذ کیا ہے[1]،

صحابہ کرام کے بعد حضرات تابعین کا دور آتا ہے، اس دور میں مکہ اور کوفہ تعلیم قرآن کے لئے خاص اہمیت رکھتے ہیں، مکہ میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے تلامذہ حضرت مجاہدؒ ١٠٣ھ، حضرت سعید بن جبیرؒ ٩٤ھ، حضرت عکرمہؒ ١٠٦ و ١٠٧ھ، حضرت طاؤسؒ ١٠٦ھ، حضرت عطاء بن رباح ١١٤ھ کا فیض جاری تھا،

کوفہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے تلامذہ حضرت علقمہ بن قیسؒ ١٠٢ھ، حضرت اسود ابن یزید ٧٥ھ، حضرت ابراہیم نخعی (٩٥ھ) اور امام شعبی ١٠٥ھ خدمتِ دین میں مصروف تھے،

ان حضرات کے سوا اس عہد کے مشاہیر میں حضرت حسن بصری ١١٠ھ، عطاء بن ابی سلمہ خراسانی، محمد بن کعب القرظی ١١٨ھ، ابو العالیہ رفیع بن مہران الریاحی ٩٠ھ، ضحاک بن مزاحم ١٠٥ھ، عطیہ بن سعید العوفی ١١١ھ، قتادہ بن دعامہ ١١٧ھ، ابو مالک، زید بن اسلم، ربیع بن انس، مرہ ہمدانی ٧٦ھ کے نام قابلِ ذکر ہیں، اس دور کی تفسیر کا بڑا سرمایہ حضرات صحابہ کرام کی روایات اور ان کے اقوال ہیں، خود تابعین عظام بھی تلاش و تفحص اور اجتہاد نیز استنباطِ مسائل سے کام لیتے تھے، قرآن کے متعلق ان کی لغوی تشریحات کو امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں جمع کر دیا ہے، اس دور میں اسرائیلیات کو تفسیر میں زیادہ دخل ہوا، اہلِ کتاب مسلمان تورات، انجیل اور ان کے شروح و حواشی کو آیاتِ قرآنی کے ضمن میں بیان کرتے اور لوگ ان کو ذوق و شوق سے سنتے، اس عہد میں ابن جریج ١٥٠ھ جو کہ نصرانی الاصل تھے، ان کی روایات زیادہ شہرت پذیر ہوئیں،

صاحب کشف الظنون نے جن کتبِ تفسیر کا ذکر کیا ہے، ان میں سے حضرات تابعین کی طرف

---

[1] مبادی التفسیر شیخ محمد خضری دمیاطی ص ۱۱،

جن کا انتساب ہے وہ یہ ہیں،

(۱) تفسیر عکرمہ (۲) تفسیر عوفی (۳) تفسیر مجاہد (۴) تفسیر والبی (۵) تفسیر زید بن اسلم،

ابن الوزیر یمنی نے ایثار الحق علی الخلق میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد علی بن طلحہ ہاشمی کی تفسیر، نیز تفسیر امام حسن بصریؒ تفسیر عطار بن رباحؒ تفسیر محمد بن کعب القرظی کا ذکر کیا ہی،

علی بن طلحہ کی تفسیر کے متعلق حافظ ابن حجر کا بیان ہی کہ اس کا ایک نسخہ امام لیث کے کاتب شیخ ابوصالح کے پاس تھا، امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ یہ نسخہ مصر میں ہے، اگر کوئی شخص اس کے لئے مصر کا سفر کرے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہی، اس صحیفہ سے ابوجعفر نحاس ۳۳۸ھ نے اپنی کتاب الناسخ والمنسوخ میں کافی اخذ کیا ہی، ابن جریر نے بھی اپنی تفسیر میں اس سے تخریج کی ہی،[1]

حضرت سعید بن جبیرؓ کی طرف بھی ایک تفسیر منسوب ہی، حضرت سعید بن جبیرؓ کی خدمت میں عبدالملک بن مروان نے لکھا کہ قرآن مجید کی تفسیر تحریر فرمائیں، چنانچہ امام موصوف نے تفسیر لکھی جو کتب خانہ شاہی میں رکھی گئی، یہی تفسیر تفسیر عطار بن دینار کے نام سے مشہور ہی،[2]

حضرات تابعین کے بعد تبع تابعین کا دور آتا ہے، ان کا اصل کارنامہ اقوالِ صحابہؓ و تابعین کا جمع کرنا اور ان کی اشاعت ہی، دوسری روایات کو بھی اُنھوں نے جمع کیا، لیکن عموماً جرح و تنقید سے الگ رہے، الا ماشاء اللہ،

اس سلسلہ میں قابلِ ذکر حضرات یہ ہیں،

سفیان بن عیینہ ۱۹۸ھ، وکیع بن الجراح ۱۹۶ھ، شعبہ بن الحجاج ۱۶۰ھ، اسحاق بن راہویہ ۲۳۸ھ، یزید بن ہارون السلمی ۲۰۶ھ، عبدالرزاق بن ہمام ۲۱۱ھ، آدم بن ابی ایاس ۲۲۰ھ، روح بن عبادہ ۲۰۵ھ، سنید ابن داؤد ۲۲۰ھ، ابوبکر بن ابی شیبہ ۲۳۵ھ، عبد بن حمید ۲۴۹ھ، ابن و ۱۹۵ھ

[1] مرأۃ التفسیر ص۱۱۴ [2] میزان الاعتدال ترجمہ عطار ابن دینار،

اس دور میں تفسیری دائرہ کو بہت وسعت ہوئی، بہ کثرت روایات کا سلسلہ پھیلا، صاحب کشف الظنون نے جن تفسیروں کا ذکر کیا ہی ان میں سے ذیل کی تفسیریں اس دور کی ہیں،

(۱) تفسیر ابن جریج ۱۵۰ھ (۲) تفسیر مقاتل ۱۵۰ھ (۳) تفسیر آدم بن ابی ایاس ۲۲۰ھ (۴) تفسیر شعبہ بن حجاج ۱۶۰ھ (۵) تفسیر عبدالرزاق بن ہمام ۲۱۱ھ (۶) تفسیر عبد بن حمید ۲۴۹ھ (۷) تفسیر وکیع بن الجراح ۱۹۷ھ (۸) تفسیر یزید بن ہارون ۲۱۷ھ (۹) روح بن عبادہ کے متعلق تہذیب میں جمعِ تفسیر کا ذکر ہی (۱۰) ابوبکر بن شیبہ کی تفسیر کا ذکر خطیب کرتے ہیں (۱۱) سنید بن داؤد کو بھی صاحبِ تفسیر مانا جاتا ہے،[1]

صاحب کشف الظنون کی ذکر کردہ تفاسیر میں ذیل کی تفسیریں بھی ابن جریر سے پیشتر کی یا ان کے عہد کی ہیں (۱) تفسیر واقدی ۲۰۷ھ (۲) تفسیر ابن ماجہ ۲۷۳ھ[2] (۳) تفسیر اشج (ابوسعید عبداللہ ابن سعید الکندی) ۲۵۷ھ (۴) تفسیر انماطی (ابواسحاق نیشاپوری) ۳۰۳ھ (۵) تفسیر بقی (حافظ ابوعبدالرحمٰن بقی بن مخلد قرطبی) ۲۷۶ھ (۶) تفسیر دینوری ۲۹۰ھ،

تفسیرِ بقی کے متعلق ابن حزم کہتے ہیں کہ اس سے اچھی تفسیر نہیں لکھی گئی،[3]

اس ضمن میں کسائی کی معانی القرآن اور فراء ۲۰۷ھ کی تفسیری کتاب کا ذکر بھی مناسب ہوگا، معانی القرآن کی تفصیل تو معلوم نہیں ہی، البتہ فراء کی کتاب کے متعلق ابن ندیم کا بیان ہی کہ وہ عمر بن بکیر کی فرمائش پر لکھی گئی تھی، عمر بن بکیر فراء کے شاگرد تھے، اور امیر حسن بن سہیل کے ساتھ رہتے تھے، امیر ان سے اکثر قرآن پاک کے مسائل دریافت کرتا، ان کو کبھی کبھی مشکل پیش آتی، اس لئے اُستاد سے درخواست کی کہ قرآن کے متعلق چند اصول یا مستقل کتاب تحریر فرمادیں، فراء نے شاگرد کی درخواست قبول کی، اور سورہ فاتحہ سے املاء کرانا شروع کیا، ابوالعباس کا بیان ہی کہ اس سے پیشتر اس قدر اچھی

[1] مرأۃ التفسیر [2] معجم المطبوعات ج ۱ ص ۲۳۲ [3] مرأۃ التفسیر ص ۴۵،

کتاب نہیں لکھی گئی۔[1]

تبع تابعین کی تفسیروں میں دو تفسیریں اور قابل ذکر ہیں، ایک تفسیر سفیان ثوری ۱۶۱ھ جس کا قلمی نسخہ کتب خانہ رامپور میں موجود ہے، اس میں وہی آیات تفسیر کے لئے منتخب کی گئی ہیں جن میں کوئی مشکل لفظ یا محاورہ یا کوئی تلمیح ہے، ہر تفسیر بیشتر تابعی یا صحابی اور کمتر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچائی جاتی ہے، مفسر نے الفاظ تفسیر میں بے حد اختصار سے کام لیا ہے، کتاب آیت لا اکراہ فی الدین کی تفسیر سے شروع ہو کر سورۂ والطور کی آیت اولیٰ کے آغاز پر ختم ہوتی ہے۔[2]

دوسری تفسیر امام مالک کی ہے جس میں قرآن مجید کی تفسیر بروایت احادیث مسندہ ہے، حافظ سیوطی نے اس کو دیکھا ہے اور اس کی تعریف کی ہے لیکن یہ مشکوک ہے، کہ یہ خود امام کی تالیف ہے یا کسی شاگرد نے امام سے اس کی تعلیق کی ہے۔[3]

مفسر ابن جریر تفسیر کے ان اہم سلسلوں کے بعد وہ سلسلہ آتا ہے جس میں ابن جریر جیسا فاضل مفسر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتا ہے، جو اپنے پیشروؤں کا مخزن اور پس روؤں کا ماخذ بنجاتا ہے، جس کی تفسیر کے متعلق ایک بزرگ خواب دیکھتے ہیں کہ وہ ابوجعفر طبری کی محفل میں ہیں ان کے سامنے ان کی تفسیر پڑھی جا رہی ہے کہ یکایک ہاتف غیبی آواز دیتا ہے کہ جس کو قرآن اسطرح سننا ہو جسطرح کہ وہ نازل ہوا ہے تو اس کتاب کو سنے۔[4]

ابو حامد احمد بن ابی طاہر اسفرائینی کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ابن جریر کی تفسیر کے لئے چین کا سفر کرے تو یہ کچھ زیادہ نہیں۔[5]

ابن خزیمہ نے اس تفسیر کو کئی سال تک مکمل دیکھا پھر کہا کہ روئے زمین پر ابن جریر سے بڑھکر کوئی عالم نہیں۔[6]

---

[1] فہرست ابن ندیم ص ۴۹ [2] معارف ستمبر ۱۹۳۵ء [3] حیات مالک ص ۴۸ [4] معجم الادبا ج ۶ ص ۴۳۹
[5] خطیب ج ۲ ص ۱۶۳ [6] ایضاً ج ۲ ص ۱۶۴،

حافظ جلال الدین سیوطی کہتے ہیں کہ اگر تم مجھ سے پوچھو کہ کس تفسیر پر اعتماد کیا جائے اور اس کو دیکھا جائے تو میں کہونگا کہ تفسیر ابن جریر طبری جس پر علماء کا اتفاق ہے کہ اسکے مثل کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی۔[1]

داؤدی مالکی کہتے ہیں کہ حسب اتفاق علماء ابن جریر کی تفسیر القرآن کے مثل کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی۔[2]

خود ابن جریر کہتے ہیں کہ میں نے تفسیر لکھنے سے پیشتر تین برس تک خدا سے دعا کی اور تفسیر کیلئے اعانت کا خواستگار رہا، خدا نے یہ دعا قبول کی،

ابن جریر کی تفسیر پر علماء کا یہ اتفاق بلاوجہ نہیں ہے بلکہ وہ اپنی خصوصیات اور اپنے امتیازات کی بنا پر اسی کی مستحق تھی، مناسب ہوگا کہ اس موقع پر اجمالاً ابن جریر کی تفسیر کی خصوصیات کا ذکر کیا جائے

(۱) اس میں کوئی شک نہیں کہ ابن جریر سے پیشتر کئی تفسیری مجموعے موجود تھے جیسا کہ ہم تاریخ تفسیر کے ضمن میں ذکر کر چکے ہیں، مگر ان مجموعوں میں سے کوئی مجموعہ بہ ترتیب مصحف تمام قرآن کی تفسیر نہ تھا، بلکہ ان کی صورت یہ تھی کہ جس کے پاس جو تفسیری روایات تھیں، وہی تفسیری مجموعہ کی شکل میں آگئیں، ابن جریر کی تفسیر سے پیشتر کے تفسیری مجموعوں میں سے ہمارے پاس سفیان ثوری کی تفسیر موجود ہے، اسکے سوا بخاری، مسلم اور ترمذی کے ابواب التفسیر موجود ہیں، جو اس زمانہ کے اس طریق پر شاہد عدل ہیں،

احمد امین مصنف ضحی الاسلام کا قیاس ہے کہ فراء نے جس تفسیر قرآن کا قصد کیا تھا، ممکن ہے کہ وہ مکمل تفسیر ہو لیکن ظاہر ہے کہ یہ محض قیاس ہی ہے،

بہرحال ہمارے سامنے بہ ترتیب مصحف قرآن کی پہلی اور جامع تفسیر صرف ابن جریر کی ہے، جو خاص اصول و قواعد کے ماتحت لکھی گئی، یہ ابن جریر کی معمولی فضیلت نہیں ہے،

(۲) ابن جریر نے بہ ترتیب مصحف تمام قرآن کی تفسیر جمع کرنے کے بعد سب سے بڑا کام یہ کیا کہ

---

[1] اتقان ج ۲ ص ۱۹۱ [2] طبقات المفسرین نسخہ مخطوطہ بانکی پور۔

ان تمام تفسیری ذخیروں کو جو ان کے عہد میں تحریری یا زبانی طور پر موجود تھے اپنی تفسیر میں جمع کر کے ان کو دست برد زمانہ سے محفوظ کر دیا، چنانچہ ذیل کے ماخذ ان کی تفسیر کا اصل قرار پائے

(۱) کتب تفسیر مصنفہ عن عبداللہ بن عباسؓ خمسۃ طرق (۲) کتب تفسیر عن سعید بن جبیر طریقین (۳) عن مجاہد ثلثۃ طرق او اکثر (۴) عن قتادہ بن دعامہ ثلاثۃ طرق (۵) حسن بصری ثلثۃ طرق (۶) عکرمہ ثلثۃ طرق (۷) ضحاک بن مزاحم طریقین (۸) عبداللہ بن مسعودؓ طریقاً (۹) تفسیر عبدالرحمن ابن زید بن اسلم (۱۰) تفسیر ابن جریج (۱۱) تفسیر مقاتل بن حیان،

ان کتابوں کے سوا دوسری احادیث مشہورہ مسندہ بھی حسب ضرورت ذکر کی گئی ہیں[1]

(۱) اس سے پیشتر ہم تفسیر ابی بن کعبؓ اور تفسیر علی بن طلحہؓ کے متعلق ذکر کر چکے ہیں کہ ابن جریر نے ان کو بھی اپنی تفسیر کا ماخذ بنایا ہے،

اس تشریح کے بعد یہ شبہہ بھی دور ہو جاتا ہے، کہ ابن جریر سے پیشتر کے تفسیری مجموعے کیا تلف ہو گئے، ؟ اور ہمارے سلف نے ان سے غفلت کی، ؟ لیکن صورت حال یہ نہیں ہے، بلکہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ابن جریر نے ان تمام مجموعوں کو اپنی تفسیر میں شامل کر کے دنیا کو ان سے بے نیاز کر دیا، آج اگر کوئی چاہے تو ابن جریر کی تفسیر سے وہ تمام سابقہ مجموعے نکل سکتے ہیں، یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کہ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں تمام حدیثی ذخائر کو جمع کر لیا ہے اور آج بھی ان کی صحیح سے وہ کتابیں نکالی جا سکتی ہیں جنکے نام ان سے پیشتر ذکر کئے جاتے ہیں،

(۳) عموماً سمجھا جاتا ہے کہ ابن جریر نے اپنی تفسیر کی بنیاد محض نقل روایات پر رکھی ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، ابن جریر نے محض جمع و نقل روایات پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ تمام اقوال کو نقل کر کے مجتہدانہ شان کے ساتھ ان کی توجیہ اور بعض کو بعض پر ترجیح دینے کی کوشش کی،[2] گویا انھوں نے روایت کے

[1] معجم الادبا ج ۶ ص ۴۳۲-۴۴۴، [2] اتقان ج ۲ ص ۱۹۰،

ساتھ درایت سے بھی کام لیا، یہ ان کی وہ خصوصیت ہے، کہ جس میں ان کے عہد تک کوئی ان کا مقابل نہیں، داؤدی طبقات المفسرین (نسخہ مخطوطہ بانکی پور) میں کہتے ہیں:۔

انہ جمع بین الروایۃ والدرایۃ	انھوں نے روایت اور درایت کو جمع
ولم یشارکہ فی ذالك احد	کر دیا، اور اس میں ان سے پیشتر اور ان کے
لاقبلہ ولا بعدہ	بعد کوئی ان کا شریک نہیں ہے،

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ان کے مختارات کو نقل کیا ہے اور کہیں کہیں اختلاف بھی کیا ہے،

(۴) ابن جریر نے دستور زمانہ کے خلاف ایک قدم اور آگے بڑھا کر یہ کارنمایاں بھی انجام دیا کہ قرآن سے متعلق اس عہد تک کے تمام پیدا شدہ مباحث کو اپنی تفسیر میں شامل کر کے اس کو اس عہد تک کی قرآنی انسائیکلوپیڈیا بنا دیا، چنانچہ تجوید، نحو، صرف، لغت، فقہ، عقائد و کلام علاوہ اور فرق باطلہ کی تردید، علوم طبیعیہ کے متعلقہ مسائل، ان کی تفسیر میں صاف طور سے ملتے ہیں جن کے پڑھنے سے اس عہد تک کے انداز فکر کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے،

تفسیر ابن جریر کے روایتی حصہ کے متعلق یہ امر ذہن نشین رہنا چاہئے کہ انھوں نے ان طرق سے جو قطعی غیر موثق ہیں، تخریج نہیں کی ہے، مثلاً محمد بن سائب کلبی، مقاتل بن سلیمان، محمد بن عمر الواقدی کہ تاریخ و سیر اور اخبار عرب کے سوا جس کے لئے یہی ذریعہ ہیں، اور کہیں ان سے اخذ نہیں کیا ہے،

تاہم چونکہ انھوں نے تمام تفسیری ذخائر کے جمع کرنے کا عزم کیا ہے، اسلئے سندی حیثیت سے ان کی روایات کے تمام طرق کی تصحیح نہیں کیجا سکتی، لیکن بقول مصنف ضحی الاسلام (ص ۱۴۳) ان تفسیری روایات کو جو سندی حیثیت سے ضعیف ہیں، بالکل کم قیمت بھی نہ سمجھنا چاہئے، یہ تسلیم کہ ان کی سند درست نہیں ہے، مگر یہ تو مسلم ہے کہ اس ضعیف السند روایت میں جو کچھ

کہا گیا ہو وہ اس آیت سے متعلق اس زمانہ کے کسی شخص کا خاص نتیجۂ فکر ہو، جو بہرحال لائقِ توجہ ہے،

ابن جریر کی مرویات پر حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں کہیں کہیں جرح کی ہو، خود ابن جریر نے بھی کہیں کہیں ضعفِ سند پر تنبیہ کی ہو، مثلاً ج ا ص۲۵، ج ۵ ص۲۷،

اوپر عرض کیا گیا ہو کہ ابن جریر کی تفسیر محض روایات کا مجموعہ نہیں ہو، بلکہ قرآن سے متعلق اس عہد تک کے پیدا شدہ مسائل کا ایک محفوظ ذخیرہ ہو، زیادہ وضاحت کیلئے اختصار کیساتھ تفسیر ابن جریر کے ان مباحث کے متعلق کچھ عرض کیا جاتا ہو،

تفسیر ابن جریر اور قراۃ: کلماتِ قرآن کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جنکو تمام صحابہ نے متفقاً یکساں پڑھا ہو، اور ان میں کوئی اختلاف ممکن نہیں ہو، دوسرے وہ کلمات ہیں جن کے طریقِ ادا اور قراۃ میں اختلاف ہوا ہو، ہر چند کہ یہ اختلاف اختلافِ تناقض و تضاد نہیں، تاہم استنباطِ احکام و مسائل میں اس کا اثر ضرور پڑتا ہے[1]، اسلئے مفسر کو اختلافِ قرات سے واقفیت بہت ضروری ہو، ابن جریر اس فن میں خاص مجتہدانہ شان رکھتے تھے، انھوں نے اپنی تفسیر میں تمام اختلافاتِ قرات کو نقل کیا ہو، نیز اس اختلافِ قرات سے مفہوم و مسائل کے تنوعات اور اختلافات پر بھی بحث کی ہو، سیاق و سباق اور دوسرے دلائل و شواہد سے ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دی،

کبھی ایک ہی صحابی سے ایک ہی لفظ کے متعلق دو تفسیریں نقل ہوتی ہیں، شبہہ ہو سکتا ہو کہ یہ اختلاف کیوں ہو؟ ابن جریر اسکی گرہ کشائی یوں کرتے ہیں، کہ یہ اختلافِ تفسیر بربنائے اختلافِ قراۃ ہو، مثلاً آیت

انما سکرت ابصارنا (حج) مست کر دی گئیں آنکھیں ہماری،

میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے دو قول منقول ہیں سکرت بہ معنی سدت اور سکرت بمعنی خذت،

اس اختلافِ معانی کو نقل کرنے کے بعد ابن جریر قتادہ سے نقل کرتے ہیں، کہ یہ اختلافِ معانی اصل میں اختلاف قراۃ کی بنا پر ہے، جس نے سکرت کو تشدید کے ساتھ پڑھا، اس نے (سدت) کے اور جس نے اسکو تشدید کے بغیر پڑھا اس نے (سحرت) کے معنی لئے ہیں،

(باقی)

---

[1] اتقان ج ا، ص۸۲.

یادِ پاستاں

از جناب مولانا امتیاز علی خانصاحب عرشی ناظم کتب خانہ ریاست رام پور

مذکورۂ بالا عنوان پر مولوی مقبول احمد صاحب صمدنی کا ایک پر مغز، مگر بیحد دلچسپ مقالہ معارف میں باقساط شائع ہو چکا ہے، اس کی پہلی قسط میں جو جنوری کے پرچہ میں چھپی تھی، "تاریخ محمدی" کا بھی مذکور ہو، کتابخانہ عالیہ رامپور میں اس تراجم علماء و اعیان کے خزانے کی دوسری جلد کا بیش قیمت نسخہ محفوظ ہو، جو میری تحقیق کے مطابق خود مصنف کے قلم کا لکھا ہوا ہے،

مخطوطات عربیہ کی فہرست مرتب کرنے کے دوران میں مجھے اس کتاب کی افادی حیثیت کا عملی تجربہ ہوا، اس کی وسعتِ معلومات سے میں اس درجہ متاثر ہوا کہ اسی وقت سے یہ عزم کر لیا تھا کہ اسکی پہلی جلد کا نسخہ تلاش کر کے دونوں کو کتابخانہ کی طرف سے شائع کرنے کی کوشش کروں گا، برٹش میوزیم کی فہرستِ مخطوطاتِ فارسی میں ڈاکٹر ریو نے اس کے ایک قلمی نسخہ کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہو کہ یہ پورے دیباچے اور جلد اول و دوم کے انتخاب پر مشتمل ہے،

اس اطلاعِ جانفزا کو دیکھ کر میں نے فوراً اس کا فوٹو طلب کیا، مگر یہ نسخہ خود ہمارے ہی نسخے کی نقل نکلا، اور اس بنا پر ترتیب و تصحیحِ متن میں اس سے زیادہ فائدہ پہنچنے کی امید جاتی رہی، تاہم اشاعت کے ارادے میں وہی پختگی موجود رہی، مولانا صمدنی مدظلہ کے مضمون سے یہ معلوم کر کے بیحد خوشی ہوئی کہ اس کتاب کا مکمل نسخہ سید محمود علی صاحب رضوی رئیس چھپرہ منو کے کتابخانہ میں موجود ہے، اور موصوف اس معاملہ میں اس درجہ دریا دل ہیں کہ مولانا کی فرمائش پر ایک انگریز کو اسکی نقل بھی عطا فرما چکے

ہیں، چونکہ ہم ہندوستانیوں کا حق ترجیح طلب ہے، اس لئے یقین ہوگیا کہ اگر موصوف سے استدعاے نقل کی گئی، تو وہ ضرور نوازش و کرم سے کام لیں گے، اور ہمیں پوری کتاب شائع کرنے کا موقع مل جائیگا

مولانا صمدنی نے اپنے فاضلانہ مقالے میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، اس سے اس کتاب کے سنہ تصنیف اور عہدِ مصنف کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہو جانے کا امکان ہے، بنا بریں ان امور کے متعلق کچھ کہنا ضروری ہے، مگر یہ جسارت خالص علمی دلچسپی کی بنا پر کی گئی ہے، اس لئے عرض کر سکتا ہوں کہ

خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

مصنف کا نام و نسب مصنف کا نام محمد بن رستم بن قباد بن عبد الجلیل بن عبد الکریم بن طوغان حارثی بدخشی ہے، اس کا خاندان اصلاً بدخشاں کا رہنے والا ہے، اسی لئے یہ لوگ اپنے آپ کو بدخشی کہتے آئے ہیں، سب سے پہلے اس کے پردادا عبد الجلیل حارثی قندھار ہوتے ہوئے ہندوستان آئے اور کشمیر میں فوت ہوئے، اس کے دادا قباد بیگ قندھاری المولد ہیں، اور دہلی میں رحلت کی ہے، باپ کی پیدائش راندیر کی ہے، اور ونگنکیرا میں عالمگیر کی چھاؤنی کے اندر انتقال کیا ہے،

حارثی نسبت سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ عربی خاندان کا آدمی ہے، اگر یہ صحیح ہے، تو پھر نام و ں میں عجمیت ترکستان کی بود و باش کا نتیجہ ہوگی، جس کی مثالیں اور نظیریں کم نہیں ہیں،

اس خاندان کے متعدد افراد کا تذکرہ کتاب میں ملتا ہے، ان تمام افراد کے مشاغل زندگی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ تیغ و قلم دونوں سے کام لیتے رہے ہیں، چنانچہ حارثی کا پردادا فقیہ حنفی ہے، دادا بڑا معقولی خصوصاً ریاضی داں ہے، باپ مختلف علوم، قراءۃ، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، کلام، شعر اور ادب کا ماہر ہے، حکمیات و ریاضیات پر بھی اچھی نظر ہے، یونانی زبان پر اتنی قدرت ہے کہ علمی کتابوں کا عربی اور فارسی میں بلا تکلف ترجمہ کرتا ہے،

مصنف کی پرورش اسی بیت السیف والقلم میں ہوئی ہے، اس لئے اس نے بھی تمام مروجہ

علوم کی تحصیل کی ہے، کتاب میں اپنے ایک استاد حدیث کا ذکر بھی کیا ہے، مگر برخلافِ آبا، مصنف کو ابتدا سے تاریخ سے دلچسپی تھی، اسی کا نتیجہ ہے کہ اُس نے اپنی عمر کے ۲۶ ویں سال میں اس انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب پر قلم اُٹھایا ہے،

مصنف کی پیدائش حارثی کی پیدائش ۱۲ جمادی الاولی سنہ ۳۰ عالمگیری مطابق سنہ ۱۰۹۸ھ (۱۶۸۷ء) کو جلال آباد میں واقع ہوئی، تعلیم سے فارغ ہو کر ۲۵ جمادی الآخرہ سنہ ۱۱۱۵ھ (نومبر سنہ ۱۷۰۳ء) کو سترہویں سال کی عمر میں شاہی ملازمت میں داخل ہوا، دورانِ ملازمت کے واقعات اور اس کی زندگی کے دوسرے کوائف کا پتہ نہیں چلتا، بجز اس کے کہ ۹ برس کی عمر میں باپ کا سایہ اس کے سر سے اٹھا تھا، "عبرت نامہ" کے نام سے اُس نے ایک کتاب لکھی تھی، جس کے دو نسخے انڈیا آفس کے کتابخانے میں موجود ہیں، اس کتاب کے آغاز میں خود اپنے حالات درج کئے تھے، افسوس کہ یہ کتاب ہمارے کتابخانے میں نہیں ہے، ورنہ اُس کی زندگی پر مزید روشنی ڈالی جا سکتی تھی، ہاں، فہرستوں وغیرہ سے اُسکی تصنیفات کے بارے میں کچھ باتیں معلوم ہوتی ہیں، جنھیں تصنیفات کے عنوان کے ماتحت لکھا جائیگا،

افرادِ خاندان حارثی نے تاریخ محمدی میں اپنے متعدد عزیزوں کا ذکر کیا ہے، مگر اس کتاب کی ترتیب سنہ وار ہے، اس بنا پر ان لوگوں کے حالات ایک جگہ نہیں ملتے، میں آیندہ سطروں میں وہ تمام ٹکڑے خود حارثی کے لفظوں میں نقل کئے دیتا ہوں،

(۱) سنہ ۱۱۱۱ھ کے ماتحت اپنے والد کے متعلق لکھتا ہے:-

"رستم المخاطب بمعتمد خاں بن قباد الملقب بدیانت خاں بن عبد الجلیل الحارثی البدخشی الاصل الہندی المولد، کان جامعاً للعلوم، لاسیما الحکمیات، خصوصاً الریاضیات، فانہ کان فیہ فرید عصرہ، وکان لہ باع طویل فی اللغۃ والعربیۃ، وکان ذا مناسبۃ تامۃ بالقراۃ والتفسیر والحدیث والفقہ والاصول والکلام والشعر والآداب، وکان عارفاً باللسان الیونانیۃ

وکان یترجم کتبهم بالعربیة والفارسیة،

وهو والد محرر هذه الاوراق، غفر الله لهما واحسن الیهما، وکانت ولادته فی شوال سنة ثمان واربعین والف ببلدة اندیر من بلاد الدکن، ومات یوم الاثنین الثامن عشر من جمادی الاولی وقت الضحی بقرب قلعة وانکنکیرا من بلاد الدکن فی معسکر سلطان العصر بالارث والاستحقاق ابی المظفر محی الدین محمد اورنگزیب بهادر عالمگیر بادشاه الغازی، اسکنه الجنان، ثم نقل الی بلدة دهلی، وکان راقم السطور یومئذ تسع عشر سنة کاملة، هزاری سوار"

اس بیان سے حارثی کے باپ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا معقولی تھا، منقولات پر بھی اچھی نظر تھی، یونانی کا ایسا عالم تھا کہ یونانی کتابوں کے عربی فارسی میں ترجمے کرتا تھا، ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء میں رانذیر میں پیدا ہوا تھا، عالمگیر کے دربار میں ہزار سوار کا منصب دار تھا، دکن کی جنگ میں لشکر سلطانی کے ہمراہ تھا، وہیں ۱۱۱۷ھ (۱۷۰۵ء) میں فوت ہوا، اور دہلی میں نعش لاکر دفن کی گئی،

(۲) ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء کے وفیات میں اپنے دادا کے متعلق لکھتا ہے:-

"قباد بیگ المخاطب بدیانت خان بن عبد الجلیل بن عبد الکریم الحارثی البدخشی، ولد بقندهار ونشاء بالهند وصار ذا منزلة عند السلطان الکبیر عالمگیر بادشاه الغازی، وکان من علماء المعقول، لاسیما الریاضیات، فانه کان فیه وحید دهره وفرید عصره، مات فی رمضان بدهلی، وله ۷۱ سنة

وهو جد محرر هذه الارقام، وقد مرابوه فی سنة، هزار و پانصدی (سماع ومآثر عالمگیری)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حارثی کا دادا بھی بڑا معقولی و ریاضی داں تھا، عالمگیر کے دربار میں اسکی منزلت تھی، اور ہزار و پانصدی کا منصب رکھتا تھا، قندھار میں پیدائش اور دہلی میں وفات ہوئی وقت انتقال ۷۰ برس کی عمر تھی، گویا ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء میں پیدا ہوا تھا، اسکی عمر اپنے باپ کے انتقال کے

وقت صرف آٹھ سال کی تھی،

(۳) ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء کے وفیات میں اپنے پردادا کے بارہ میں کہتا ہے:-

"عبد الجلیل بن عبد الکریم بن المولی طوغان الحارثی البدخشی، نزیل الهند، العالم الفقیه الحنفی مات بکشمیر فی هذه السنة تقریبًا، وبیاقی ابناه: قباد بیگ المخاطب بدیانت خاں فی ۱۰۸۳ھ وحسن بیگ فی ۱۰۷۴ھ (کذا سمعت من بعض رجال قومی)"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حارثی خاندان کا پہلا شخص جو وارد ہندوستان ہوا، عبد الجلیل تھا، یہ حنفی فقیہ تھا، غالبًا دنیوی جاہ و منزلت نصیب نہیں ہوئی، اس کا سنہ وفات بھی حارثی کو صرف تخمینی طور پر خاندان کے کسی بڑے بوڑھے سے معلوم ہوا ہے، کتاب میں عبد الجلیل کے باپ دادا کا ذکر نہیں ملتا، اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے بہت سے غیر ہندی خاندانوں کی طرح اس خاندان کے تعلقات بھی بدخشاں سے بالکل ٹوٹ گئے تھے، اور پس ماندوں کو صرف عبد الجلیل اور اس کے اخلاف کا علم تھا،

(۴) عبد الجلیل کے ایک بیٹے کا ذکر کیا جا چکا ہے، دوسرے بیٹے حسن بیگ کے متعلق ۱۰۷۴ھ/۱۶۶۳ء کے ماتحت لکھا ہے،

"حسن بیگ المتخلص به آگهی، بن عبد الجلیل بن عبد الکریم الحارثی البدخشی، در اوائل سال فوت شد، عمرش ۶۵ سال بود، وے بجودتِ نظم ونثر مشهور بود، وعم پدر مسوده اوراق است و پدرش در ۱۰۲۰ھ گذشت، (سماع)"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن بیگ ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء میں پیدا ہوا، اور ۱۰ برس کی عمر میں یتیم ہو گیا، یہ بڑا ادیب تھا نظم ونثر دونوں پر قدرت رکھتا تھا، اور "آگہی" تخلص کرتا تھا، میں نے خان آرزو کے تذکرہ مجمع النفائس، اور عاشقی کے تذکرہ، نشتر عشق میں آگہی کو تلاش

کیا، مگر ان دونوں میں اس کا ذکر نہیں ہے،

(۵) سنہ ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۷ء کے ماتحت اپنے دادا کے چچازاد بھائی کا ان لفظوں میں ذکر کیا ہے:-

"ابوتراب بن عبدالعزیز بن عبدالکریم الحارثی البدخشی من عرفاء العصر، مات بدکن ولہ

۶۵ سنۃ وہو ابن عم جد مسود الاوراق"

(۶) سنہ ۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء کے ذیل میں اپنے چچا کے بارہ میں لکھتا ہے:-

"دیوانگن مخاطب بمعتمد خاں بن قباد مخاطب بدیانت خاں از امرای عالمگیری بود،

در ماہ جمادی الاولی در دکن فوت شد، ووے عم مسود این اوراق است، عمرش ۶۳ سال

پدرش در سنہ ۱۰۸۳ھ گذشت، ہزار و پانصدی"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حارثی کا چچا سنہ ۱۰۳۸ھ/۱۶۲۸ء میں پیدا ہوا تھا، وہ اس کے باپ کا بڑا بھائی

تھا، اسی لئے اپنے باپ کے منصب ہزار و پانصدی پر فائز بھی ہوا، ۶۳ سال کی عمر میں دکن کے

اندر غالباً لشکر عالمگیری میں سنہ ۱۱۰۱ھ کو اس کا انتقال ہوا،

(۷) باپ کے ایک چچازاد بھائی کا ذکر سنہ ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء کے ماتحت کرتے ہوئے کہتا ہے:-

"محمد بیگ مخاطب بہ مخلص خاں بہادر بن احمد بیگ حارثی بدخشی، از کبار امرای شاہ عالمی

نیمروز شنبہ ۱۲ صفر بحکم جہاندار شاہ بقتل رسید، سنش ۵۲ سال، ووے ابن عم والد محرر این

ارقام بود واخلاق کریمہ بسیار داشت، پر چہار ہزاری"

حارثی کا یہ رشتے کا چچا سنہ ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۱ء میں پیدا ہوا تھا، یہ شاہ عالم بہادر شاہ اول کے دربار کا

بہت بڑا سردار اور چہار ہزاری منصب اور خطاب مخلص خاں بہادر سے سرفراز تھا،

(۸) اپنے حقیقی چچا کے بیٹے کا ذکر سنہ ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸ء میں اس طرح کیا ہے:-

"محمد نفخر خاں بن دیوانگن مخاطب بمعتمد خاں بن دیانت خاں حارثی بدخشی، از امرای

عصر، ۷ رمضان، در شاہجہان آباد فوت شد، عمرش ۵۶ سال، وگاہے شعر ہم میگفت، ووے

ابن عم مسود اوراق ست، وپدرش در سنہ ۱۱۰۱ھ گذشت"

یہ سنہ ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۵ء میں پیدا ہوا، دہلی کے امرا میں سے تھا، شعر بھی کہہ لیتا تھا، ۵۶ برس کی عمر میں مر گیا،

(۹) حارثی نے اپنے ایک حقیقی بھائی کا بھی ذکر کیا ہے، چنانچہ سنہ ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۲ء کے ماتحت لکھتا ہے:-

"میرزا عبدالرحمن متخلص بغیرت بن رستم مخاطب بمعتمد خاں بن قباد مخاطب بدیانت خاں

حارثی بدخشی، جوانِ مستعد طالب علم شاعر بود، و بمحاسنِ اخلاق اتصاف داشت، روز شنبہ

۵ ذی العقدہ در شاہجہان آباد فوت شد، یک پہر روز مانده عمرش ... سال و ۳ ماہ

ووی برادر اعیانی وجامعِ این اوراق بود"

حارثی کا بھائی اس خاندان کا تیسرا شاعر ہے، کتاب کے رامپوری نسخے میں اسکی عمر کے ہندسے

پڑھنے میں نہیں آئے، اس لئے یہ بتانا ممکن نہیں کہ یہ حارثی سے بڑا تھا یا چھوٹا، البتہ عبارت سے

یہ ضرور مترشح ہے کہ اُس نے جوانی میں انتقال کیا، محولۂ بالا دونوں تذکروں میں اسکا بھی ذکر نہیں ہے

(۱۰) سنہ ۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء میں اپنی والدہ کا ذکر کیا ہے، کہتا ہے:-

"زاہدہ خانم بنت میرک بیگ بن خواجہ بیگ الحارثیہ، زوجہ محمد رستم المخاطب بمعتمد خاں

ابن قباد بیگ الحارثی، ووالدۃ جامع ہذہ الاوراق، میرزا محمد بن معتمد خاں، توفیت غرۃ

جمادی الاولی بشاہجہان آباد ولہا ۸۳ سنۃ الا اشہر، وکانت جامعۃ بخصال الخیر من الورع

والعفاف والنجار ومحاسن الاخلاق، کثیر البر والاحسان الی الاقارب الاباعد وقد مرزوجہا فی سنہ ۱۱۱۷ھ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حارثی کی والدہ تقریباً سنہ ۱۰۷۱ھ/۱۶۶۰ء میں پیدا ہوئی تھی، اور اپنے شوہر سے

۲۳ سال چھوٹی تھی، خود حارثی کی والدہ کا خاندان بھی حارثی بدخشی ہے، اور اس لئے بعید نہیں ہے

کہ اوپر جاکر یہ سب عبدالجلیل کے کسی بزرگ سے مل جاتے ہوں،

(۱۱) اپنے ماموں کے متعلق ۱۱۲۰ھ / ۱۷۰۸ء میں لکھتا ہے:۔

" محمد خواجہ مخاطب بہ مخلص خاں بن میرک بیگ بن خواجہ بیگ حارثی بدخشی" از امرائے عصر، در ماہ صفر بشاہجہان آباد فوت شد، عمرش ۴۳ سال بود، خال حقیقی جامع این اوراق بود"

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ محمد خواجہ ۱۰۷۷ھ / ۱۶۶۷ء میں پیدا ہوا تھا، اور اپنی بہن سے عمر میں چھوٹا تھا، حارثی نے اسے بھی امرائے عصر میں ظاہر کیا ہے، اور مخلص خاں خطاب بتایا ہے،

(۱۲) حارثی کے دوسرے ماموں کا نام نعمان بیگ بن میرک بیگ تھا، ان کے پوتے کا تذکرہ ۱۱۵۴ھ / ۱۷۴۱ء کے ماتحت ان لفظوں میں کیا ہے:

" مظفر حسین متخلص بہ حسین بن محمد غیاث بن نعمان بیگ بن میرک بیگ حارثی بدخشی، شاعر خوش کلام ۲۱-۲۲ شوال در ہمراہی نجیب علی خاں ... فوجدار افتادہ در جنگ ..."

باقی عبارت حاشیہ کے ساتھ کٹ گئی ہے، یہ اس خاندان کا چوتھا ادیب ہے،

(۱۳) اسی خاندان کے ایک فرد کا تذکرہ ۱۱۳۹ھ / ۱۷۲۶ء کے ماتحت کیا ہے، مجلد نے حاشیہ کے ساتھ کچھ عبارت کاٹ دی ہے، اس لئے مصنف سے اسکے رشتہ کا پتہ نہیں چلتا، اس کے متعلق کہتا ہے:

" میرزا محمد افلاطون بن جعفر بیگ الحارثی البدخشی ثم الدہلوی، الزاہد العالم الفقیہ الحنفی وکان کامل العقل وافرالدہر، مات بشاہجہان آباد، یوم الاثنین ۲۲، ربیع الاول، ولد ۱۰۶۶ سنۃ"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص ۱۰۶۶ھ / ۱۶۵۵ء میں پیدا ہوا تھا اور دہلی میں فوت ہوا، یہ زاہد اور فقیہ تھا،

(۱۴) ایک اور فرد اسی خاندان کا ۱۰۲۵ھ / ۱۶۱۶ء میں مذکور ہے، اسکے متعلق کہتا ہے:۔

" جمیل بیگ بن ابوتراب حارثی، از امرائے اکبر شاہی و جہانگیر شاہی، در کشمیر فوت شد، در صلاح و تقوی و علم و فضل اختصاص داشت، و عبدالجلیل کہ جد والد راقم ....

مومی الیہ بود، (کہذا رایت فی بعض مسودات قدمار قومی، عرفات العاشقین)"

اصل کتاب میں چند لفظ کسی نے مٹا دئے ہیں، اسلئے رشتہ معلوم نہ ہوسکا، بظاہر یہ ابوتراب حارثی مصنف کے پر دادا عبدالجلیل کے بھائی عبدالعزیز کا بیٹا ہے، اگر یہ صحیح ہے، تو پھر جمیل بیگ اس کے دادا کا چچازاد بھائی ہوا،

مطالعہ کرنے والوں کی سہولت کے خیال سے میں حارثی کے والدین کے خاندان کا شجرہ علیحدہ علیحدہ لکھے دیتا ہوں جو حسبِ ذیل ہے،

دادھیال کا شجرہ

- عبدالکریم بن طوغان حارثی بدخشی
  - عبدالجلیل
    - قباد بیگ
      - دیوافگن
        - محمد فغفور
      - رستم
        - محمد مصنف تاریخ محمدی
        - عبدالرحمن بخرت
    - احمد بیگ
      - محمد بیگ
    - حسن بیگ
  - عبدالعزیز
    - ابوتراب
      - جمیل بیگ

نانھیال کا شجرہ

- خواجہ بیگ حارثی
  - میرک بیگ
    - زاہدہ خانم
      - محمد مصنف تاریخ محمدی
      - عبدالرحمن بخرت
    - محمد خواجہ
    - نعمان بیگ
      - محمد غیاث
        - مظفر حسین

تعلیم و تصنیف مصنف کے خاندان میں علم و دولت دونوں کی برکتیں پائی جاتی تھیں، اس بنا پر یقین ہے، کہ اس کی تعلیم و تربیت میں خاص کوشش کی گئی ہوگی، علوم آلیہ کے متعلق خود اُس کا کوئی بیان ہمارے سامنے نہیں ہے، البتہ ۱۱۱۳ھ؁ کے ماتحت اپنے حدیث کے ایک استاد کا ان لفظوں میں تذکرہ کیا ہے:

"الشیخ مقرب اللہ بن جار اللہ بن نور اللہ بن نور الحق بن الشیخ المحدث عبد الحق بن سیف الدین الترک الدہلوی العلامۃ المتفنن الحنفی مات فی رمضان بدہلی، و لہ نحو ستین سنۃ، و ہو اول من قرأت علیہ الحدیث"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حارثی نے سب سے پہلے دہلی کے مشہور محدث خاندان کے بزرگ شیخ مقرب اللہ سے حدیث پڑھی،

ہمارے کتبخانہ میں پچاس ساٹھ مختلف فنون کی قلمی کتابوں پر مصنف کے دستخط اور مہریں ہیں، چنانچہ ابن الہیثم کی شرح مصادرات کے پہلے صفحہ پر جو الفاظ اس نے لکھے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:-

"اللہ اکبر

من عواری الزمان عند العبد الضعیف الراجی رحمۃ ربہ المنان میرزا محمد بن معتمد خان ختم اللہ لہ بالامن والایمان"

اس عبارت کے اوپر بیضوی شکل کی چھوٹی سی مہر ہے، جس میں "یا محمد" لکھا ہوا ہے، حیدرآباد کے کتاب خانے میں بھی متعدد کتابوں پر یہی عبارت اور مہر میں نے دیکھی ہے، تذکرہ صوفیہ پر ایک کتاب موسوم بہ مختصر مجمع الاحباب" کتاب خانۂ عالیہ رامپور میں محفوظ ہے، اس کے پہلے صفحے پر حارثی نے اپنے قلم سے ۲ سطروں کا ایک نوٹ لکھا ہے، جس میں بتایا ہے، کہ یہ کتاب حلیۃ الاولیا ابونعیم اصفہانی اور صفوۃ الصفوۃ ابن الجوزی کا اختصار ہے، اور اس کا مصنف محمد بن الحسن، علامہ نووی متوفی ۶۷۶ھ؁ کے شاگرد کا شاگرد ہے، کتاب کے حاشیوں پر جابجا تصحیحات اور ذیلی عنوانات اپنے قلم سے لکھے ہیں، اور کتابوں پر بھی اس کی تصحیحیں پائی جاتی ہیں،

ان امور سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اُس نے تمام مروجہ علوم پڑھے تھے، اور ان علوم کی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اُسے زیادہ دلچسپی تاریخ و تذکرہ سے رہی ہے چنانچہ اس نے سب سے بڑی کتاب تاریخ ہی پر تصنیف کی، اور اس کا نام تاریخ محمدی رکھا، میں پہلے اسکی دوسری کتابوں کا تذکرہ کرتا ہوں:-

رد البدعۃ ان میں کی پہلی "رد البدعۃ" ہے، شاہ محمد حمزہ صاحب مارہروی نے ۱۱۸۴ھ؁ میں اس کتاب کا مطالعہ کیا تھا، تاریخ محمدی کے ورق ۱۵۵ الف کے حاشیہ پر شاہ صاحب لکھتے ہیں:-

"رسالہ رد البدعۃ بل تحقیق الما . . . از تالیفات مولف این تاریخ، مرزا محمد حارثی بدخشی در ۱۱۸۴ھ؁ نزد این فقیر رسید، فوت والد خود محمد رستم ہفدہم جمادی الاولیٰ سنہ مسطورہ نوشتہ، و این رسالۂ مذکورہ در عنفوان شباب بعمر بست سالہ ارقام ساختہ، تحقیقات خوب بکار بردہ"

اس تحریر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رسالہ رد البدعۃ ۱۱۱۸ھ؁ کے قریب لکھا گیا تھا، اور یہ مصنف کی ابتدائی تصنیفات میں سے ہے،

مفتاح النجا دوسری تصنیف مفتاح النجا فی مناقب آل عبا ہے، یہ عربی زبان میں اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مناقب پر لکھی گئی ہے، آنے والی دونوں کتابوں نزل الابرار، اور تحفۃ المحبین میں اس کا حوالہ ملتا ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے، کہ ان دونوں سے پہلے مصنف نے اسے تصنیف کیا تھا،

تحفۃ المحبین تیسری تالیف تحفۃ المحبین بمناقب الخلفاء الراشدین ہے، جو عربی زبان میں خلفائے راشدین کے فضائل پر لکھی گئی ہے، اس کتاب کے خاتمہ سے پتہ چلتا ہے کہ جمعہ کے دن، ۲ رمضان ۱۱۲۵ھ؁ کو فرخ سیر کے عہدِ حکومت میں مصنف نے اسے ختم کیا ہے،

کتاب خانۂ عالیہ رامپور میں اس کا ایک مخطوطہ ہے، جسے سید رحم علی کاتب نے ۱۳۶ صفحوں پر

نستعلیق خط میں لکھا ہے، اس کا انداز تحریر نمبر ۴ سے ملتا جلتا ہے، اور وہ سنہ ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) کی نوشتہ ہے، بعید نہیں ہے کہ یہ بھی اسی سال کے قریب لکھی گئی ہو،

نزل الابرار | چوتھی کتاب نزل الابرار فی فضائل الائمۃ الاطہار ہے، یہ بھی عربی زبان میں لکھی گئی ہے، اس کا آغاز ۲ رمضان ۱۱۲۶ھ (۱۷۱۴ء) کو ہوا تھا، اور دہلی کے کسی امیر کے نام معنون تھی کتاب خانہ عالیہ رامپور میں اس کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے، جو بخط نستعلیق معمولی اوسط سائز کے ۲۷ صفحوں پر ۱۴ ذیقعدہ ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) میں لکھا گیا ہے، اس کا خط نمبر ۳ کے مشابہ ہے، جس سے میں یہ قیاس کرتا ہوں کہ سید رحم علی ہی نے اُسے بھی لکھا ہے دیباچے میں مصنف نے کہا ہے کہ چونکہ مفتاح النجا میں مناقب کی ہر طرح کی حدیثیں جمع کی گئی تھیں اس لئے بعض احباب نے صرف صحیح حدیثوں پر مشتمل کتاب کی تالیف کی فرمائش کی، یہ کتاب اس فرمائش کی تعمیل میں مرتب ہوئی ہے،

عبرت نامہ | پانچویں تالیف عبرت نامہ ہے، یہ فارسی زبان میں لکھی گئی ہے، شروع میں مصنف نے اپنے حالات لکھے ہیں، ان کے بعد عالمگیر کی حکومت کے آخری تین سالوں کے مجمل حالات، اور بعد ازاں وفاتِ عالمگیر (۱۱۱۸ھ ۱۷۰۷ء) سے فرخ سیر کی وفات (۱۱۳۱ھ ۱۷۱۹ء) تک کے واقعات درج کئے ہیں،

ڈاکٹر ایتھے نے انڈیا آفس لائبریری کی فہرستِ مخطوطاتِ فارسی میں نمبر ہائے ۳۹۲ و ۴۰۳ پر اس کتاب کا ذکر کیا ہے، مگر پہلے نمبر پر اس کا نام عبرت نامہ اور دوسرے پر تاریخ محمد بن معتمد خاں لکھا ہے، ڈاکٹر ریو نے برٹش میوزیم کے فارسی مخطوطات کی فہرست (ج ۳ ص ۹۴۴) میں محمد بخش آشوب کی "تاریخ محمد شاہی" کے ضمن میں اس کتاب کا اس لئے تذکرہ کیا ہے کہ آشوب اپنی تاریخ میں جابجا اس کے حوالے دیتا ہے، اور اس پر اعتماد ظاہر کرتا ہے، ڈاکٹر ریو اسے "یادداشتہائے میرزا محمد صاحب" کہتا ہے، ایتھے کا خیال ہے کہ ان یادداشتوں سے یہی "عبرت نامہ" مراد ہے،

تاریخ محمدی | حارثی کی سب سے بڑی اور قابلِ قدر کتاب تاریخ محمدی ہے، ہمارے پاس اس کا جو نسخہ بخطِ مصنف موجود ہے، اُس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ صرف وفیات کا سن وار تذکرہ ہے، مگر دیباچہ میں مصنف نے لکھا ہے کہ اس میں اُمت محمدیہ کے واقعات بھی بالاجمال بیان کئے گئے ہیں، مولانا صمدانی صاحب نے بھی چھپرا مئو کے نسخہ میں واقعات کا مذکور ہونا ظاہر فرمایا ہے،

کتاب کے شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں سیرت محمدی بعد ازاں سنہ ہجریہ کی ایجاد کا قصہ اور پھر سنہ وار وفیات درج ہیں، اس کتاب کے نام کے متعلق مصنف لکھتا ہے:-

"از آنجا کہ ایں کتاب مستطاب محتوی بر احوال اکابر امت مرحومۂ محمدیہ و زمان ظہور دولت یافتۂ آنحضرت است و ذکر امم دیگر را شامل نیست، و جامع ایں اوراق پریشاں نیز باسم سامی حضرت خیر الانام می تسمی دارد، ایں کتاب والا انتساب را بدیں دو مناسبت تاریخ محمدی نام نہادہ شد"

کتاب کی ترتیب و تالیف میں جن پچھلی تصنیفات سے مدد لی ہے، دیباچے میں ان کی فہرست دیدی ہے، اور چونکہ ہر بار پورا نام لکھنے میں ہرج ہوتا؛ اسلئے دیباچہ میں ان کے مخففات بتا کر اصلِ کتاب میں ہر شخص کے نام کے اوپر یہ مخففات سرخ روشنائی سے لکھدئے ہیں، اپنے معاصرین کے ناموں کے اوپر عصری سرخ روشنائی سے لکھدیا ہے، دوسری جلد کے شروع میں بھی ایک دیباچہ لکھا ہے، جس میں کتابوں کے رموز و علامات کا اعادہ کیا ہے،

سنہ تصنیف | مصنف دیباچہ میں آغازِ تصنیف کے متعلق کہتا ہے کہ

"بنا بریں امور، روز دوشنبہ بیست و ہفتم جمادی الآخرہ سال یکہزار و یکصد و بیست و چہار ہجری دریں مہم اہم شروع نمودم"

۱۱۲۴ھ (۱۷۱۲ء) میں کتاب کے آغاز سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مصنف نے، جس کی پیدائش ۱۰۵۸ھ (۱۶۴۸ء)

میں واقع ہوئی تھی، اپنی عمر کے چھبیسویں سال میں اس انسائیکلوپیڈیا کو شروع کیا،

کتاب خانۂ عالیہ رامپور کے نسخہ میں مصنف کے قلم کی تحریر سنہ ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء میں ختم ہو جاتی ہے، یعنی یہ آخری سنہ ہے جس کے ماتحت اُس نے وفیات درج کئے ہیں، اس کے بعد صرف ایک سنہ کا عنوان تو اس کے قلم کا لکھا ہوا ملتا ہے، مگر اس کے اندراجات دوسرے خط اور دوسرے اندازِ تحریر میں ہیں، بنا بریں میرا قیاس ہے کہ ۱۱ شوال سنہ ۱۱۶۱ھ کے بعد کی کسی تاریخ کو مصنف کا انتقال ہو جانے کے باعث یہ سلسلہ منقطع ہوا ہے، اور اس صورت میں ۳۷ سال کی طویل مدت اس کی ترتیب و تدوین میں صرف ہوئی ہے،

ڈاکٹر ریو اپنی فہرست (ج ۳ ص ۹۵۵) میں سنہ ۱۱۹۰ھ / ۱۷۷۶ء کو اس کا سالِ اختتام قرار دیتے ہیں، اور باقی آیندہ سالوں کے اندراجات کو کسی دوسرے کی طرف منسوب کرتے ہیں، مگر میں اسے غلط فہمی پر محمول کرتا ہوں، اور اس کا منشا برٹش میوزیم کے نسخے کو قرار دیتا ہوں، جس میں سنہ مذکور تک مسلسل ایک ہی قلم سے متوفی اصحاب کا تذکرہ لکھا گیا ہے، چونکہ میں ریو کے نسخے کو رامپور کے نسخہ کی نقل مانتا ہوں، اس بنا پر تاریخِ اختتام کے فیصلے کے لئے نسخۂ رامپور کو شہادت میں پیش کرنا چاہتا ہوں، لہذا پہلے ریو کے نسخے کے بارہ میں دو چار اہم باتیں لکھ دینا مناسب ہوگا برٹش میوزیم کے نسخے کے سرورق پر حسبِ ذیل نوٹ مندرج ہے،

"منتخبات از جلد اول و دوم تاریخ محمدی مملوکہ سید آل رسول مارہرہ والہ، کتاب ہذا از کتابیکہ بذریعہ محمد نصر اللہ خان ڈپٹی کلکٹر ضلع علی گڈھ دستیاب شد، بطور انتخاب ازو نقل گرفتہ شد، از جلد اول از سنہ ۴۲۱ نہایۃ سنہ ۵۹۹ دہ ورق، جلد دوم از سنہ ۶۰۰ نہایۃ سنہ ۱۲۰۰ھ"

اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈپٹی نصر اللہ خان کی معرفت تاریخ محمدی کا کوئی نسخہ سید آل رسول صاحب مارہروی نے حاصل کر کے اس کے منتخبات جدا نقل کرا لئے تھے، نیز یہ کہ اس نسخے میں

جلد دوم کا آغاز سنہ ۶۰۰ھ سے اور اختتام سنہ ۱۲۰۰ھ پر ہوا تھا، سید آل رسول صاحب کے لئے یہ منتخب نسخہ ایک خوشنویس نے نقل کیا، چونکہ اصل میں سنہ ۱۱۹۰ھ سے عنوانات پر سنہ لکھکر ہر سنہ کے نیچے وفیات لکھے تھے، اس لئے کاتب نے بھی نقل میں اس کا اتباع کیا، بعد ازاں بلا عنوان متعدد وفیات کا اصل میں اندراج تھا، اس حصہ کو منتخب کر کے کاتب نے بھی یوں ہی نقل کر دیا، ڈاکٹر ریو کے سامنے یہ نقل تھی، اُنھوں نے سنہ ۱۱۹۰ھ تک کے تسلسل کو پیشِ نظر رکھ کر یہ نتیجہ نکال لیا کہ اس سنہ تک اصل مصنف کا کام ہے، لہذا یہی سالِ اختتام ہوگا،

اب ہمیں نسخۂ رامپور کی طرف متوجہ ہونا چاہئے، یہ نسخہ سید مہدی میاں صاحب نے جو مارہرہ کے مشہور برکاتی خاندان کے ایک فرد تھے، نواب جنت مکان کے حضور میں پیش کیا تھا، یہ اوّل سے ناقص ہونے کے باعث ورق ۹ سے شروع ہوتا ہے، جس کے حصہ الف پر سنہ ۶۰۰ھ کے بقیہ متوفین کے نام ہیں، اور حصہ ب سے سنہ ۶۰۱ھ کے وفیات شروع ہوتے ہیں، سنہ ۱۱۶۱ھ تک جو ورق ۵۹۹ الف پر ختم ہوتا ہے، ایک ہی قلم کی تحریر ہے، صرف دو چار جگہ دوسرے قلم سے سادہ جگہ پر ایک دو ایسے نام بڑھائے گئے ہیں جو اصل مصنف سے رہ گئے تھے، سنہ ۱۱۶۲ھ سے مذکورۂ بالا دوسرے قلم کے اندراجات شروع ہوتے ہیں، سنہ ۱۱۶۳ھ سے سنوں کے سرخ عنوان بھی اسی قلم کے ہیں، سنہ ۱۱۹۰ھ تک کتاب سنہ وار ہے، مگر ورق ۶۱۸ ب پر سنہ ۱۱۹۱ھ سے سنہ ۱۱۹۶ھ تک متوفی اصحاب کو ایک ہی صفحہ پر لکھا ہے، اس کے بعد کا ورق ضائع ہو گیا ہے، سنہ ۱۱۹۷ھ کے ماتحت استاد المحققین سید آل محمد قادری مارہروی کا نام لکھا ہے، اس نام کے ختم پر کسی اور شخص نے لکھا ہے "میاں ابنِ شاہ حمزہ فی سنہ ۱۱۹۸" گویا یہ تیسرا قلم ہے جو اس کتاب پر چلا ہے، ایک دو جگہ اور بھی اس خط میں اضافے نظر آتے ہیں،

دیکھنا یہ ہے کہ یہ دونوں خط کس کے معلوم ہوتے ہیں، کتبخانۂ رامپور میں اس خاندان کے ایک بزرگ سید شاہ آل احمد بن سید شاہ محمد حمزہ مارہروی کی دو کتابیں "آئینۂ محمدی جلد پنجم" اور "کشکول" محفوظ ہیں، ان دونوں کتابوں کی کتابت دو کاتبوں نے کی ہے، بلکہ ایک دو جگہ ایسا شبہہ گذرتا ہے کہ تیسرا شخص بھی شریک تھا، تاریخ محمدی میں آخری دو خطوں میں سے جو خط زیادہ پایا جاتا ہے

وہ ان دونوں کتابوں میں بھی موجود ہے، اور دوسرے خط کی عبارتیں بھی مذکورۂ بالا دونوں کتابوں
میں پائی جاتی ہیں،

خط اول کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ یہ شاہ آل احمد صاحب مارہروی کا ہے، چونکہ
آئینہ محمدی اور کشکول مسودے کی شکل میں ہیں، اس بنا پر یہ قرین قیاس ہے کہ ہم اسے بخط مصنف
وبخط دیگر قرار دیں، اور اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ مصنف نے دوسرے کاتبوں کو کیوں شریک کتابت
کیا، تو اس کے جواب میں ان دونوں کی ضخامت کے عذر کو پیش کریں، ریو کے نسخے کے سرورق پر
جو تحریر ہے، اس کا انداز بھی کسی قدر اس شاہ آل احمد والی تحریر کے انداز سے ملتا جلتا ہے،

ان تمام امور کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ "تاریخ محمدی" کا لندنی نسخہ مارہرہ
میں شاہ آل رسول صاحب کے لئے تیار ہوا، رامپور کا نسخہ مارہرہ کے اسی خاندان کے ایک بزرگ نے
دربار رامپور میں پیش کیا تھا، اس نسخے کے اندر جن دو خطوں میں اضافے نظر آتے ہیں، ان میں سے ایک خط
شاہ آل احمد صاحب کی کتاب آئینہ محمدی اور کشکول کے ایک خط کے مشابہ ہے، آئینہ محمدی کے اس خط کے
متعلق میری رائے یہ ہے کہ خود شاہ آل احمد صاحب کا ہے، اگر یہ درست ہے تو پھر تاریخ محمدی کے اندراجات
بھی انہی کے ہونگے، اور چونکہ لندنی نسخے کے سرورق کی تحریر بھی انہی کی معلوم ہوتی ہے، اس بنا پر یہ قیاس
درست ہوگا کہ لندنی نسخہ رامپور کے نسخہ کی نقل ہے،

یہ قیاس حد یقین تک پہنچ جاتا ہے، جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لندنی نسخے کی جلد ثانی میں انہی
لفظ اور فقروں کے لئے سادی جگہیں چھوڑ دی گئی ہیں، جو رامپور کے نسخے میں یا تو حاشیہ کیساتھ
کٹ چکے ہیں، یا کاغذ کے گل جانے کے باعث پڑھنے میں نہیں آتے، کیونکہ اگر وہ کسی دوسرے نسخے
کی نقل ہوتا تو دشوار تھا کہ دونوں نسخوں میں الفاظ و فقرات کا فقدان بالکل یکساں ہوتا،

مذکورۂ بالا دعویٰ کے ثبوت کے بعد یہ تسلیم کرلینا پڑے گا کہ تاریخ محمدی، ارشوال ۱۱۶۱ھ

کے بعد ختم ہوگئی، اور ڈاکٹر ریو نے جو ۱۱۹۰ھ تک اس کے زمانہ تالیف کو دراز کیا ہے، یہ درست نہیں
ہے، کیونکہ ۱۱۶۱ھ کے بعد کے اندراجات مارہرہ کے مشہور خاندان برکاتیہ کے بزرگوں نے اپنے قلم سے لکھے ہیں
مولانا صمدانی صاحب نے تاریخ محمدی میں واقعات تاریخی کا مجمل بیان بھی دیکھا ہے، ہمارے نسخہ میں
بجز دس یا پانچ مقامات کے صرف وفیات درج ہیں، ارباب تاریخ کی دلچسپی کی خاطر اسکے ایک سال کے
اندراجات کا اعادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، مگر خوف طوالت ایسے سنہ کو چنا گیا ہے جس میں بہت
کم اندراجات ہیں،

سنہ ۱۱۲۳ھ کے ماتحت لکھا ہے:-

"سنہ الف وثلث وعشرین ومائۃ، متوفیان ایں سال"

عصری/ رسالہ سید نصرت اللہ احراری

"محمد منعم الملقب بمنعم خاں ثم بمعظم خاں خانخاناں بہادر ظفر جنگ وفادار، وزیر شاہ عالم
بادشاہ روز دوشنبہ ۱۲ ایا المحرم در نزدیکی بوریہ بمرض ناسور قدیم فوت شد، عمرش شصت سال
وچند ماہ، "ہفت ہزاری"

کذا سمعت من اولادہ عاقبت محمود مخاطب بسرافراز خان بن نعمت اللہ مخاطب بسہراب
خاں بن حسام الدین خاں بن نظام الدین خاں بن غیاث الدین علی مخاطب باصف خاں
از امرائے عالمگیر شاہی در برہان پور فوت شد"

عصری،

میرزا لشکر اللہ حسینی مخاطب بمرتضی خاں از کبار امرائے شاہ عالمی و پسرش حفظ اللہ خاں
در سنہ ۱۱۶۱ھ خواہد آمد"

عصری،

" الشیخ عبد الباقی بن الشیخ محمد وارث لتر کی لقریغ الدہلوی جامع العلم والعمل صاحب السجایا الرضیۃ الاخلاق المرضیہ، مات بدہلی ۱۲ صفر بمرض حجر المثانہ وکان قد جاز الخمسین "

نسخۂ رامپور کی کیفیت | یہ نسخہ فلس کیپ سائز کے ۱۶۱۰ اوراق پر مشتمل ہے، کاغذ بادامی کشمیری ہے، عبارت کی روشنائی سیاہ اور عنوانوں کی شنگرفی ہے، پرانے صفحہ داغ سے پتہ چلتا ہے کہ شروع کے ۸ ورق گم ہو گئے ہیں، کتاب پر آب رسیدگی کرم خوردگی اور پیوند کاری کے نشان جابجا نظر آتے ہیں، خصوصاً پہلے ورق کی کچھ عبارت بھی ضائع ہو چکی ہے، کہیں کہیں مجلد کتاب نے حاشیوں کیساتھ الفاظ بھی تراش ڈالے ہیں، متعدد مقامات پر لکھا ہے "درمسودۂ اول باید دید" "یا تحقیق باید کرد" متعدد جگہوں پر ایک دو لفظ کے بقدر بیاضیں چھوڑی ہیں، ان باتوں سے مترشح ہے کہ یہ نسخہ خود مصنف کا مبیضہ ہے، چونکہ اس کا خط میرزا محمد بن معتمد خاں کے ان خطوط جیسا ہے، جو مختلف کتابوں پر ثبت ہیں، اسلئے مجھے اس کتاب کے بخط مصنف ہونے میں کوئی شبہہ نہیں ہے،

وفات مصنف | حارثی کے سالِ وفات کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں، جس شخص نے ہزاروں انسانوں کے سنینِ وفات تحقیق کر کے لکھے، خود اس کے سنہ انتقال کا معلوم نہ ہونا کتنا عبرتناک ہے، مگر یہ دنیا کی کوئی نئی رسم نہیں ہے، لاکھوں انسان آج اس زمین کے اندر دبے پڑے ہیں، جن کے بارے میں کوئی یہ بتانے والا تک نہیں، کہ کون تھے اور کیا تھے، ان میں جلیل القدر عالم بھی ہیں، جہانگشا بادشاہ بھی اور خدا رسیدہ صوفی بھی، مگر روح و مادے کی کوئی طاقت گمنامی کی تاریکی کو دور نہ کر سکی،

فاعتبروا یا اولی الابصار،

تاریخ فقہ اسلامی

فارسی کے چند قدیم شعراء

از جناب غلام مصطفیٰ خاں صاحب ایم اے ایل ایل بی (علیگ) لکچرر کنگ ایڈورڈ کالج، امراوتی (برار)

فارسی کے چند قدیم شعراء یعنی معزّی، سنائی، ادیب صابر، انوری وغیرہ کے چند سنین کے متعلق یہ معلومات پیش کرتا ہوں، مجھے خود احساس ہے کہ ان کے متعلق ابھی بہت کچھ محنت کی ضرورت ہے لیکن فی الحال اسی کو پیش کیا جاتا ہے، اس مضمون میں کہیں کہیں بعض بزرگوں سے اختلافِ رائے بھی ہے، لیکن اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ میری اصلاح فرمائیں تاکہ اس سلسلہ میں بعض اہم چیزیں بھی پردۂ خفا سے باہر آجائیں اور ہمارے ملک کو فائدہ پہنچے،

معزّی | معزّی کے سلسلہ میں اس کے باپ امیر الشعراء (عبد الملک) برہانی نیشاپوری کی تاریخ وفات کے متعلق قیاس آرائی کرتا ہوں جو ممکن ہے کہ صحیح ہو سکے، اسکے متعلق چہار مقالہ (مقالۂ دوم حکایت پنجم) میں معزّی کا بیان اس طرح ہے:

"... پدر من امیر الشعراء برہانی رحمۃ اللہ علیہ در اول دولت ملک شاہ بشہر قزوین از عالم فنا بعالم بقا تحویل کرد و دراں قطعہ کہ سخت معروف است مرا بسلطان ملک شاہ سپرد دریں بیت ؎

من رفتم و فرزند من آمد خلف صدق ‌ ‌ ‌ ‌ اورا بخدا و بخداوند سپردم،

پس جامگی و اجراء پدر بمن تحویل افتاد و شاعر ملک شاہ شدم و سالے در خدمت پادشاہ روزگار گذاشتم کہ جز وقتے از دور اورا نتوانستم دیدن و از اجراء و جامگی

یک من و یک دینار نیافتم ...... روزے کہ فردائے آں رمضان خواست بود ... در آں دل تنگی بنزد علاء الدولہ امیر علی فرامرز رفتم کہ پادشاہ زادہ بود و شعر دوست و ندیم خاص سلطان بود و داماد او ......"

علاء الدولہ امیر علی فرامرز جس کو یہاں ملک شاہ کا داماد لکھا گیا ہے، میرزا قزوینی اپنے حواشی میں ارسلان خاتون کا شوہر بتلاتے ہیں جو چغری بیگ (المتوفی ۴۵۲ھ/۱۰۶۰ء) کی بیٹی اور ملک شاہ کی پھوپھی تھی اور جو پہلے خلیفہ قائم بامر اللہ کی بیوی تھی، اخبار الدولۃ السلجوقیۃ (ص [1]) سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ قائم بامر اللہ کی یہ شادی ۴۴۸ھ/۱۰۵۶ء میں ہوئی تھی، اور صفحہ ۱۷ میں اس خلیفہ کی تاریخ وفات ۱۲ شعبان ۴۶۷ھ (مطابق پنجشنبہ ۲ اپریل ۱۰۷۵ء) ہے، اگر اس خاتون کا عقدِ ثانی خلیفہ کی وفات کے بعد ہوا تھا، تو وہ (عدت کے ایام کے بعد) ۴۶۸ھ/۱۰۷۵ء کے پہلے کیا ہوا ہوگا؟

اب دوسری طرف آئیے، ملک شاہ کی سلطنت کا زمانہ ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء[1] سے ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء تک تھا، چہار مقالہ کی حکایت میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ برہانی کی وفات ملک شاہ کے ابتدائی عہد میں ہوئی تھی یعنی بیس سال کی حکومت کے پہلے چوتھائی حصہ میں گویا زیادہ سے زیادہ ۴۷۰ھ/۱۰۷۷ء تک ضرور ہو چکی ہوگی، اور اس کی وفات کا زمانہ وہ تھا جبکہ علاء الدولہ امیر علی فرامرز سے اس خاتون کا عقدِ ثانی ہو چکا تھا، جو ۴۶۸ھ/۱۰۷۵ء کے پہلے نہیں ہو سکتا تھا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ برہانی کی وفات ۴۶۸ھ/۱۰۷۵ء اور ۴۷۰ھ/۱۰۷۷ء کے درمیان کسی وقت واقع ہوئی ہوگی۔

اب معزی کے کچھ حالات اس کے کلام ہی سے معلوم کیجئے، اس کے کلام کے اجزار ہندوستان کے بعض کتاب خانوں میں ملتے ہیں، لیکن شاید مکمل دیوان جیسا کہ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب نے لکھا ہے (اورینٹل کالج میگزین ص ۱۰، نومبر ۱۹۳۵ء) طہران میں پروفیسر سعید نفیسی کے یہاں ہے، بہرحال جو کچھ ہم کو مل سکتا ہے،

[1] اخبار الدولۃ السلجوقیۃ (مطبوعہ لاہور) میں ملک شاہ کے باپ الپ ارسلان کی تاریخ وفات (ص ۴۵) ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء ہے یعنی اسی سال ملک شاہ (ص ۵۶) تخت نشین ہوا، پھر ص ۸۳ پر اس کی وفات کا سال ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء ہے، لیکن راحت الصدور میں ۴۶۶ھ سے ۴۸۶ھ تک ہے،

اس میں سے یہ چند باتیں پیش کیجاتی ہیں،

ہم لکھ چکے ہیں کہ برہانی کا انتقال ۴۷۰ھ/۱۰۷۷ء کے پہلے ہو چکا تھا، یعنی اُس وقت تک معزی نے ملک شاہ کے دربار میں رسائی حاصل کر لی تھی، اور اس بادشاہ کی خدمت میں اس کا سب سے پہلا کلام وہ دو رباعیاں ہیں جو مقالۂ دوم کی حکایتِ پنجم میں مذکور ہیں، لیکن جیسا کہ اسی حکایت میں ہے کہ نظام الملک کو شعر و شاعری پسند نہ تھی، اس لئے معزی ان[1] کی مدح کیا لکھتا، پھر بھی ہم کو چند قصیدے اُن کی مدح میں ملتے ہیں جن کے کچھ اشعار یہ ہیں:-

بہ ذرّہ مشک از ابر بہار و بادِ شمال	موشّح است زمین و معطّر است جبال
نظامِ ملکِ شہنشہ قوامِ دینِ رسول[2]	خدایگانِ وزیران و قبلۂ اقبال
ابو علی حسن آں صاحبے کہ حضرتِ اوست	امانِ لشکرِ امطال و قبلۂ آمال[3]

ایک قصیدے کا مطلع یہ ہے،

اے بتوفیق و ہدایت دینِ یزداں را قوام	اے بتدبیر و کفایت ملکِ سلطاں را نظام[4]

ملک شاہ (المتوفی ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء) کی مدح میں کئی قصیدے ہیں، ایک عید الفطر کے موقع پر لکھا تھا جس کا ایک شعر یہ ہے:

بر معز الدیں ملک شہ آفتابِ اودویں	روزِ عید روزہ داراں فرخ و فرخندہ باد[5]

ذیل کا قصیدہ ۴۷۹ھ/۱۰۸۶ء میں جب کہ ملک شاہ، مملکتِ روم کو فتح کر کے پہلی مرتبہ بغداد پہنچا ہے، لکھا ہوگا، اس کے متعلق یہ شعر کافی ہیں:-

[1] ان کا زمانہ درباری رسائی کی وجہ سے حاسدوں سے بھرا ہوا تھا، دولت شاہ نے قطران کے حال میں لکھا ہے کہ وطواط اپنے معاصرین میں صرف قطران کو شاعر سمجھتا تھا، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ وطواط کی حدائق السحر میں راحت الصدور والے کوئی شاعر نہیں ہیں، معزی کے حال میں دولت شاہ لکھتے ہیں کہ خاقانی نے معزی کو تسلیم کیا ہے، اور وطواط کے منکر ہیں اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ چہار مقالہ انوری کو نہیں پہچاننا چاہتا [2] مونس الاحرار ص ۵۸۶، حبیب گنج [3] انتخاب دواوین شعرائے متقدمین ورق ۵۸۲ آ حمیدیہ لائبریری بھوپال [4] ایضاً ورق ۵۸۲ ب،

اے ز دار الملک رفتہ بہ سوے سفر ― بازگشتی سوے دار الملک با فتح و ظفر

آں ظفرہاے کہ در یک سال حاصل شد ترا ― صد مجلد بیش باید تا بگوییم مختصر

در فتوحِ شام و روم امسال دیواں ساختم ― ساخت باید در فتوحِ ہند و چیں سالِ دگر

تو بہ بغدادی و در روم از نہیبِ لشکرت ― ہست قیصر مستمند و لشکرِ او سوگ در[1]

ملک شاہ کی مدح میں ایک بہت اچھا قصیدہ ملتا ہے جس کے کچھ اشعار یہ ہیں:-

رسد ہر ساعت از دولت نشانے ― پیام آید ز گردوں ہر زمانے

کہ چوں سلطان معز الدین ملک شاہ ― نہ باشد در جہاں صاحب قرانے

جہاں را راے او چوں آفتابے ― زمیں را تختِ او چوں آسمانے

نہ جز در طاعتش پروردہ عقلے ― نہ جز در خدمتش آسودہ جانے

جہانے را ہمی ماند سپاہش ― عجب باشد جہانے در جہانے[2]

پھر بقولِ دولت شاہ، معزی نے نظام الملک کے قتل پر یہ رباعی کہی تھی:-

نشناخت ملک سعادتِ افسرِ خویش ― در منقبت وزیر خدمت گرِ خویش

بگماشت بلاے تاج بر لشکرِ خویش ― تا در سرِ تاج کرد تاجِ سرِ خویش

اور یہ مرثیہ بھی پایا جاتا ہے،

کے تواں گفتن کہ شد ملک شہنشہ بے نظام ― کے تواں گفتن کہ شد دینِ پیمبر بے قوام

شد نگار عالم آں کو کرد عالم را نگار ― شد بکامِ دشمن آں کو دید دشمن را بکام[3]

اور دونوں (ملک شاہ اور نظام الملک) کی وفات پر معزی نے یہ شعر لکھے:-

رفت در یک ماہ بفردوسِ بریں دستورِ پیر ― شاہ برنا از پے او رفت در ماہِ دگر

---

[1] انتخاب دواوین شعرائے متقدمین ورق ۴۰۵ الف [2] ایضاً ورق ۴۰۰ ب [3] ایضاً ورق ۵۸۲ ب،

کردنا گہ قہرِ یزداں عجزِ سلطاں آشکار ― قہرِ یزدانی ببین و عجزِ سلطانی نگر[1]

پھر ارسلان ارغو (المتوفی ۴۸۹ھ ۱۰۹۶ء) کی مدح میں کئی قصیدے ملتے ہیں، کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

سیدِ شاہانِ مشرق ارسلان ارغو کہ ہست ― آفتابِ اصل و تاجِ دودہ و فخرِ تبار

اے جواں دولت جہاندارے ہمایوں شہریار ― اے بشاہی از ملک سلطاں جہاں یادگار[2]

دوسرے شعر میں ارسلان ارغو کے والد ملک سلطان (برادر ملک شاہ) کا ذکر ہے، اس کے متعلق معزی کے ان اشعار میں بھی تذکرہ ہے:-

جہاں شدہ است بسلطانیِ تو خرم و شاد ― کہ یادگارِ جہانی تو از ملک سلطان

تو آں شہی کہ بہ آخر زماں نشاں دادہ است ― محمد عربی سیدِ زمین و زمان

رکابِ او ست بلخ و نہیب و ہیبتِ او ― ہمی رسد سوے ہندوستان و ترکستان[3]

ایک جگہ اسی ممدوح کی مدح میں معزی نے "کینت" بھی بتائی ہے،

بر گوے دولت از شاہانِ گیتی سر بسر ― ارسلان ارغوں کہ بودش ارسلاں سلطان پدر

کینتِ من ہست بوبکر و عمر نیزہ آمدہ است ― سخت شوریدہ ست و مشکل کار بوبکر و عمر[4]

پھر نظام الملک کے بیٹے فخر الملک مظفر (المتوفی[5] محرم ۵۰۰ھ جون ۱۱۰۶ء) کی مدح کے اشعار

---

[1] یہ دو شعر کئی جگہ ملتے ہیں، دولت شاہ نے تیسرا مصرع اس طرح لکھا ہے: "اے دریغا آں جہاں شاہے، وزیرے این چنیں"

[2] انتخاب بھوپال، ورق ۵۰۰ الف [3] ایضاً ورق ۴۰۰ ب [4] انتخاب بھوپال ورق ۵۰۰ الف ۴۹۸ھ ۱۱۰۴ء اور ۵۱۱ھ ۱۱۱۷ء کے درمیان (عہد محمد بن ملکشاہ) کسی وقت معزی نے زین الملک کی فرمائش پر رودکی کا جواب لکھا ہوگا (چہار مقالہ مقالہ دوم حکایت دوم)

[5] تاریخ بیہق (ص ۷۶) میں مصنف نے لکھا ہے کہ فخر الملک کا قتل ۱۰ محرم ۵۰۰ھ میں ہوا ہے اور مجھے خود وہ یاد ہے کیونکہ میں اس وقت بچپن میں نیشاپور میں پڑھتا تھا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ کتاب میں ۵۰۰ھ (ابن خلدون جلد ۴، ص ۱۳۲) کے بجائے غلطی سے صرف ۵۰۰ھ رہ گیا ہے، کیونکہ مصنف تو ۴۹۹ھ میں پیدا ہوا تھا اگر دوسرے سال واقعہ ہوتا تو وہ کیونکر یاد رکھ سکتا تھا۔ آثار الوزرا (ورق ۶۲، بانکی پور) میں فخر الملک کے متعلق آذری کے (بیں) اشعار لکھے ہیں جنہیں سے چند یہ ہیں،

فخر بنگر کہ بود فخر الملک ― بود بحر وزارتش را فلک ― در زمان ولایت وے کیس ― فتح کرد او ممالکِ غزنیں

مجلسے ساخت بہر عیشِ وزیر ― پر ز اشراف جملہ شاہ و امیر ― بود آں روز ساعتِ نوروز ― کرد برنے بطالعِ فیروز

بھی صبح صادق میں ہیں :-

قوام شرع فخر الملک فرزند قوام الدین　　　مظفر کز ظفر دارد مزاج و صورت و جوہر[۴۶]

اور غالباً جمال الملک بن نظام الملک کی مدح میں معزی کہتا ہے :-

جمالِ دولت باز آمد و زمانہ بخواست　　　کہ بے جمال بود دولتِ شہِ عالم

ز گفتۂ پدرِ من سزائے تست دو بیت　　　کز آں دو بیت شود طبع شاد و دل خرم

بلند بخت دولت خدائے داد ترا　　　نہ خاص داد و نہ عام نہ خال داد نہ عم

بجاں عزیز بود تن نخواستہ نہ بود　　　چو جان بجائے بود خواستہ نباید کم[۴۷]

لیکن مجھے اس ممدوح کے متعلق کوئی تیقن نہیں ہے، جس طرح کہ اسی شاعر کے یہ دو شعر بے نشان

معلوم ہوتے ہیں :-

مجلس بدولت عمیدی ز بہر طمع　　　مدیح برد بہ ایام جعفر و محمود

مجلس تو من آوردہ ام ز بہر شرف　　　عزیز عقدے نگزیدہ از میانِ عقود[۴۸]

سنجر نے ۵۱۱ھ میں بہرام شاہ کو غزنیں میں تخت نشین کرایا، غالباً سنجر کی اسی واپسی پر معزی نے کہا :-

شہ مشرق ملک سنجر بدار الملک باز آمد　　　سپاس و شکر یزداں را کہ شاد و سرفراز آمد

ز دار الملک غائب شد ز بہر فتح و فیروزی　　　کنوں با فتح و فیروزی بدار الملک باز آمد

دگر چہ حرص را آز ما فزون است از ہمہ چیزے　　　عطائے او کہ بخشش را فزوں از حرص و از آمد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۱)

چوں گرفت آں نبید جام بکف　　　بنظارہ ملوک صف در صف

ناگہاں جام او فگند از دست　　　از ہوا بر زمیں زد و بشکست

ہمہ گفتند این چہ حال افتاد　　　وایں گروہی چگونہ ات دل داد

داد پاسخ وزیر با تدبیر　　　کیں ندامت بد از پئے تقصیر

کین چنیں جو ہمہ ہوا کہ بود　　　صرف کردم بے خطا بدو بود

بود جوہر مناسب تندیل　　　کہ فگندہ از برائے کعبہ سبیل

ازیں چیں چونکہ تعریف و تطیف　　　بود لائق بداں مقام شریف

چوں بشنید آں ہدایت از دستم　　　زدمش بر زمین و بشکستم

۴۶ بدیع سوم ورق ۱۰۲ الف　۴۷ انتخاب بھوپال، ورق ۵۰۰ ب　۴۸ ایضاً ورق ۵۰۳ ب،

بخورشید و بچرخ اور اکنم تشنہ ازاں معنی　　　کہ خورشیدِ کمند آمد و چرخ نیزہ باز آمد

ہمیشہ باخبر باشد کہ مر محمود غازی را　　　نشاط و شادی از زلف و بناگوشِ ایاز آمد[۴۹]

پھر سنجر کے وزیر وجیہ الملک شرف الدین ابو طاہر سعد بن علی القمی کی مدح میں معزی کے متعدد قصیدے ملتے ہیں، اس وزیر کا انتقال ۲۵ محرم ۵۱۶ھ (چہار شنبہ ۵ اپریل ۱۱۲۲ء) کو ہوا تھا، کچھ اشعار ملاحظہ ہوں :

صاحب عدل ابو طاہر سعد بن علی　　　کہ شد از سعد و علو در ہمہ آفاق علم

آں کہ گشت از ہنرش فرعِ معالی عالی　　　واں کہ گشت از بخشش اصلِ معانی محکم

آثار الوزراء (ورق ۱۰۷ الف) میں ان اشعار کے ساتھ معزی کی یہ رباعی بھی اسی کی مدح میں شامل ہے :

اے بر سرِ خلق سایۂ اقبالت　　　آراستہ اخلاقِ تو چوں احوالت

بے بہرہ نماندے کسے از افضالت　　　کہ در خورِ ہمتِ تو بودے مالت

اس کی مدح کا ایک طویل قصیدہ میرزا قزوینی کے بست مقالہ (ص ۵۹) میں ہے، اس کے علاوہ جیب گنج سے ایک قصیدہ صنعتِ سوال و جواب میں بھی پڑھئے، اس میں ۹ شعر ہیں لیکن صرف چند کافی ہیں :

گفتم بعقل دوش کہ اے احسن الصور　　　گفتا چگونہ یافتی از حسنِ من خبر

گفتم ضمیرِ من شجرِ باغِ حکمت ست　　　گفتا شدہ ست باغ مزین بدیں شجر

گفتم کہ ایں شجر ہمہ سالہ ثمر دہد　　　گفتا مدائحِ شرف الدین دہد ثمر

گفتم وجیہ ملک و پسندیدہ ملوک　　　گفتا کہ زینِ دولت و پیرایۂ بشر

گفتم سپہرِ سعد و علو سعد بن علی　　　گفتا سرِ سعادت و پیرایۂ ظفر

گفتم جہاں تن است و خراساں از و سر　　　گفتا ہرات و مرو از و ہچو چشم و سر[۵۰]

۵۱ انتخاب بھوپال، ورق ۵۰۲ الف،
۵۲ مونس الاحرار ص ۱۰۲۶ تا ۱۰۲۸، جیب گنج،

اس وزیر کے بعد ہی نظام الدین تغرل[1] طغان بیگ محمد بن سلیمان الکاشغری محرم ۵۱۶ھ (اپریل ۱۱۲۲ء) سے مقرر ہوا، (آثار الوزرا (ورق ۲، ۱ ب) میں یہی تاریخ ہے، اور اس کے علاوہ دستور الوزرا (ص ۱۹۳) میں بھی یہ بیان ہے کہ یہ وزیر دو سال اور کچھ ماہ تک مقرر رہا، معزی نے وزارت کی تہنیت میں کہا ہے

صدر نیک اختر محمد بن سلیمان آں کہ ہست — چوں محمد دیں پرست و چوں سلیمان ملک دار

از نظام رسم او شد شغل گیتی بر نظام — وز نگار کلک او شد کار عالم چوں نگار

باغ ملت را ز رسم او پدید آمد درخت — سال دولت را ز عدل او پدید آمد قرار

پھر سنجر کے وزیر قوام الدین ابو القاسم (المتوفی ۵۲۹ھ ۱۱۳۴ء) کی مدح کی ہے۔

ہست شکر بار یاقوت تو اے عیار یار — نیست کس را زاں یاقوت شکر بار بار

قاسم الارزاق قاسم آنکہ اندر حل و عقد — ہست عزم او میان نیک و بد دیوار وار[2]

حبیب السیر (جزو چہارم، جلد دوم ص ۱۰۳) میں تاریخ گزیدہ کے حوالے سے معزی کی دو رباعیاں درج ہیں جو سنجر کے گھوڑے سے گرنے اور پھر اسی گھوڑے کے حاصل ہو جانے پر معزی نے کہی تھیں، لیکن سنجر کی مدح میں ایک قصیدہ ہمکو ایسا ملتا ہے جس سے شاعر کی مدح گوئی کا کچھ زمانہ معلوم ہو سکتا ہے۔

داور گیتی ملک سنجر کہ اندر کار ملک — کس نیارد کرد با او گفت و گوے داوری

آں جہاں دارے کہ گر تازد بہ ہند و چین و روم — تازہ گرداند مسلمانی بجاے کافری

---

[1] اس کے نام میں بہت اختلاف ہے لیکن میرا خیال ہے کہ تغرل طغان بیگ ہی صحیح ہے جیسا کہ سید حسن غزنوی نے لکھا ہے۔

امیر عادل تغرل طغان دریا دل — کہ جان بپارد از دل ہمہ سپاہ ترا

معزی کا ایک قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے، (انتخاب بھوپال، ورق ۵۶ ب)

بفال فرخ و عزم درست رائے صواب — سفر گزیدم و کردم سوے رحیل شتاب

اور سید حسن غزنوی اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

چو عزم کردم سوے سفر برائے صواب — بریدہ گشت امیدم ز دیدن احباب

[2] مجموعہ قصائد فارسی ص ۳۳ حبیب گنج یا مونس الاحرار ص ۱۰۵ ص ۱۰۹ حبیب گنج،

در میان کفر و دیں شمشیر تو سدے قوی ست — در تو آں گفتم کہ در محمود گوید عنصری

من چو از زر سخن گنجے نہم در مدح تو — مہر آں زر ہا ملک شاہی بود یا سنجری

خدمت سی سالہ را آخر بباید حرمتے — حرمت سی سالہ در خدمت بباشد سر سری[1]

اگر اس "خدمت سی سالہ" کے متعلق ایک موٹا حساب عہد ملک شاہی سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ قصیدہ ۵۰۰ھ (۱۱۰۶ء) میں لکھا گیا ہے، کیونکہ ۴۷۰ھ (۱۰۷۷ء) تک جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے، معزی کو ملک شاہی دربار میں رسائی ہو چکی تھی، اور اگر سنجر ہی کا زمانہ لیا جائے تو پھر ۵۱۱ھ (۱۱۱۷ء) سے تیس سال ۵۴۱ھ (۱۱۴۶ء) میں پورے ہوتے ہیں، اور سنجر کے تیر سے زخمی ہونے اور پھر اچھے ہونے کے بعد معزی کا ۵۴۲ھ (۱۱۴۷ء) میں مرنا صحیح ہو سکتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ معزی کی وفات ۵۴۲ھ (۱۱۴۷ء) کے پہلے ہو چکی ہوگی، کیونکہ قوام الدین ابو القاسم (المتوفی ۵۲۹ھ ۱۱۳۴ء) کی مدح کے بعد کسی اور ممدوح کی مدح ہم کو نہیں ملتی، اس کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ ہمارے پاس مکمل دیوان نہیں ہے، یا یہ کہ معزی نے آخر عمر میں مدح گوئی کو بہت ہی کم کر دیا ہوگا، لیکن اگر اسکی وفات ۵۴۲ھ میں مان لیجائے تو پھر اس نے عمر بہت زیادہ پائی ہوگی، کیونکہ ۴۷۰ھ (۱۰۷۷ء) کے قریب اس نے جو رباعیاں (مقالۂ دوم، حکایت پنجم) کہی تھیں وہ اس کی پختگی طبع کا ثبوت دیتی ہیں، جو اسے تقریباً ۲۵ سال سے پہلے کیا حاصل ہوئی ہوگی، اس حساب سے ۵۴۲ھ (۱۱۴۷ء) میں اس کی عمر ۹۰-۹۲ سال کی ہوگی جو محتاج ثبوت ہے۔

(باقی)

---

[1] مجموعہ قصائد فارسی ص ۲۰۶، ص ۲۰۷ حبیب گنج،

تلخیص و تبصرہ

کیرکٹر

زندگی کا جوہر کیرکٹر ہے، زندگی کی رفعت اور عظمت کا مدار صرف کیرکٹر پر ہے، انسانی فطرت کا بہترین مظہر کیرکٹر ہی ہے، کیرکٹر ایک اخلاقی نظام ہے، جس کا نمونہ ایک متوازن، مربوط اور مرصع شخصیت پیش کرتی ہے، سوسائٹی کا خمیر کیرکٹر ہی سے عبارت ہوتا ہے، صالح کیرکٹر ایک ایسی قوت ہے جو خلوت جلوت اور منبر و محراب کی ترغیبات سے بالاتر ہے، کھوٹے سکہ کی طرح کھوٹے کیرکٹر کی کمی نہیں، اس کو پرکھ لینا دشوار نہیں، صالح کیرکٹر آفتاب کی طرح بلند و بالا اور روشن ہوتا ہے، جس طرح آفتاب کی روشنی چھوٹے سے چھوٹے سوراخ سے دیکھی جا سکتی ہے، اسی طرح نہایت معمولی اور عام باتیں جو حسن، خوبی اور آبرو کی آئینہ دار ہوتی ہیں، کیرکٹر کو واضح کرتی ہیں،

کیرکٹر کی تکمیل بڑی صبر آزما ہوتی ہے، جس طرح سمندر کے اندر مونگے کی چٹانیں قرنوں میں چھوٹے چھوٹے کیڑوں کی مسلسل جد و جہد سے بنتی ہیں، صالح کیرکٹر اسی طرح دیر میں بنتا اور مکمل ہوتا ہے،

زندگی کی قدر و قیمت کا معیار اس کا اخلاقی وزن و وقار ہے، ضمیر کی رہنمائی میں کیرکٹر ہی انسان کو زندگی کی حقیقی نعمتوں سے آشنا اور اُن سے سرور رکھتا ہے، زندگی میں حقیقی کامیابی کے لئے دولت، قوت، جاہ، نمود و نمائش اور شہرت ضروری نہیں، بلکہ صرف کیرکٹر سب سے زیادہ ضروری اور اہم چیز ہے، آپ کا کیرکٹر ویسا ہی ہوگا جیسا آپ اسکو بنانا چاہیں گے، فطرت کی بخششیں اور انعامات عام و ارزاں

ہیں، اور دماغ و ذہن کی روشنی میں یہ سب کا حصہ ہیں، یہ روشنی مختلف زاویوں سے مختلف قوت کے ساتھ لوگوں تک پہنچتی ہے، اکثر مدہم، کہیں روشن، کہیں بالکل ہلکی اور کہیں تقریباً معدوم، اس کا ماتم جائز نہیں، ان خوبیوں کا ثبوت دیجئے جو ہر شخص کے حصہ میں آچکی ہیں، اور آپ بھی اس کے حصہ دار ہیں، خلوص، سنجیدگی، شفقت، ترحم، عالی ظرفی کا اختیار اور تعیشات اور خفیف الحرکتی سے اجتناب، کیرکٹر انہی چیزوں سے عبارت ہے، قدرت نے آپ کو ان سے محروم نہیں کیا ہے، ان بخششوں کے باوجود اگر آپ کیرکٹر سے محروم ہیں تو یہ صرف آپ کی محرومی اور ذمہ داری ہے،

وہ بات کبھی نہ کیجئے جو باعثِ ندامت ہو سکتی ہے، صرف ایک اچھی رائے آپ کے لئے سب سے زیادہ اہم ہونا چاہئے، اور وہ آپ ہی کی رائے ہے یعنی آپ کا ضمیر مطمئن ہونا چاہئے، مطمئن ضمیر مستقل نشاط ہے، یہ بات کیسی حیرت انگیز ہے کہ اکثر ہم دوسروں کو ترغیباتِ نفس کی دعوت نہیں دیتے لیکن خود کس آسانی سے اُن کا شکار ہوتے رہتے ہیں،

ہم اگر بلند نظر ہونا نہ سیکھیں گے تو تنگ نظر اور پست نظر ہو جانا لازمی ہے، حُبِ جاہ اور ہوس پرستی کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اُن کی تکمیل کبھی نہیں ہو سکتی، جو لوگ ان کا شکار ہوتے ہیں، وہ سکینت اور تشکر کے جذبہ سے محروم ہو جاتے ہیں، انسان کو ترقی کرنی چاہئے، لیکن ہم میں اکثر اپنی ترقی کس قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں، حوصلہ کی تشکیل اور تکمیل کے لئے ذرائع میں احتیاط بہت ضروری ہے، ناجائز ذرائع سے حاصل شدہ عروج جو بظاہر عروج ہے، لیکن درحقیقت زوال ہے،

ہمارا حوصلہ نفس پر قابو حاصل کرنا اور اس پر حکومت ہونا چاہئے، یہ حقیقی بادشاہت ہر شخص کے اختیار میں ہے، حقیقی ترقی شخصیت کی تزئین اور علم و عمل سے حاصل ہوتی ہے، فرض کی ادائیگی انسان کا اولین اور بلند ترین حوصلہ ہونا چاہئے، ہمارا علم، ہمارے خیالات و اعتقادات کچھ قیمت نہیں رکھتے اگر ہمارے اعمال ناقص ہیں،

دیانت اور صداقت کیرکٹر کے نہایت اہم اجزا ہیں، دیانت نہ صرف بہترین بلکہ واحد صحیح ترین حکمت عملی ہی، صداقت انسان کی متاعِ گرانمایہ ہی، صداقت سے انحراف، احترام خداوندی سے محرومی اور انسانوں سے مرعوبیت کی شہادت ہی، اپنی غلطی پر شرمندہ ہونا بہت مناسب ہی، لیکن غلطی کے اقرار پر کبھی بھی شرمندہ نہ ہونا چاہیے، انسان کو انسان بنانے کے لئے فرائض کی ادائگی اور زندگی کے کارناموں کے لئے بہت سی خوبیاں ضروری ہیں، ان میں سب سے اہم و ناگزیر خوبی جس کے بغیر انسان انسانیت اور زندگی کی بلندی و رفعت سے محروم رہتا ہی، صداقت ہی،

بڑوں کی بڑائیاں اور نیکوں کی نیکیاں اسلئے زندہ ہیں کہ وہ ایسے جری اور بہادر تھے کہ ان کی حقیقی اور ظاہری زندگی میں کوئی پردہ حائل نہ تھا، ان کی شخصیت حقیقت تھی، جس نے انکی یاد کو دوام بخشا،

جو شخص تنگ مزاجی اور خیالات فاسدہ کا شکار ہو جاتا ہی، وہ اپنے دل میں ایک ایسے عفریت کو جگہ دیتا ہی جو حاکم مطلق بن کر اس کے سکون و مسرت کا خاتمہ کر دیتا ہی، رشک و حسد، فکر و بے چینی، خوف اور تنگ نظری سے اُس کی روح و جسم کا امتزاج و توازن برباد ہو جاتا ہی،

اقتدار و قوت حاصل ہونے کے بعد ہمکو قہر و غضب کے بجاے انصاف و اخلاق کا نمونہ بننا چاہئے، صاحب اختیار کو کبھی یہ نہ سوچنا چاہئے کہ وہ کیا کر سکتا ہی، بلکہ دیکھنا چاہئے کہ کیا کرنا مناسب ہوگا، مسرت کا سیدھا راستہ یہی ہی،

گناہ کی معافی کا یہ مطلب نہیں ہی کہ ہماری سزا نہ ہوگی، سزا نہ ملنا نہ صرف ناممکن ہی، بلکہ بڑی بدقسمتی بھی ہے، حقیقت یہ ہی کہ بدی میں خوشحالی سے محرومی ایک بڑی سخت محرومی ہی، گذشتہ غلطیوں کی یاد حال و مستقبل کو تلخ بنا دیتی ہی، جن کے ساتھ زیادتی کی گئی ہی وہ معاف کر سکتے ہیں، لیکن ان کی معافی سے مجرم اپنے جرم کی سیاہی اور سوزش میں اور زیادتی محسوس کرتا ہی، حقیقت یہ ہے کہ طور و طریقہ اور طرز و روش ہی سے زندگی عبارت ہے، زندگی کی مسرت اور شادکامی کا مدار انہی چیزوں پر ہی، ظاہری امور کوئی اہمیت نہیں رکھتے، ماحول اور

فضا کی کوئی اہمیت نہیں، سب سے زیادہ اہم ہمارے اعمال ہیں، جن سے ہماری شخصیت بنتی ہی، اسلئے ہر روز نفس کا محاسبہ ضروری ہی، عمل سے عادت، عادت سے کیرکٹر اور کیرکٹر سے قسمت کی تشکیل و تکمیل ہوتی ہے، ہم سب میں روزانہ کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہتا ہی، خواہ اچھا ہو یا بُرا، اس لئے ضروری ہی کہ ہم ہر شب میں سوچا کریں کہ ہم میں کیسا اضافہ ہوا،

ایک مشہور فلسفی شاعر کا خیال ہے کہ انسانوں کی دو قسمیں ہیں، اہل خیر اور اہل شر، اگر خدانخواستہ آپ کا تعلق موخر الذکر سے ہے تو آپ دوستوں کو دشمن، خوشگوار کو تلخ، زندگی کو پُرغم اور دنیا کو زندان بنا دیں گے، اس کے برعکس اگر آپ کسی کے دل میں ایک نیک اور مبارک خیال پیدا کر سکتے ہیں، یا کسی کی زندگی کی ایک ساعت پر مسرت بنا سکتے ہیں تو آپ کا یہ کارنامہ ایک فرشتہ کی لائی ہوئی رحمت کے مانند ہوگا، چند لمحوں کے لئے نفس کا محاسبہ ذکر و شغل کا ضروری جزو ہونا چاہئے، صرف نیکیوں پر غور کرنے سے آپ ہر اُس چیز سے بالاتر ہو جائیں گے، جسمیں بدی یا بُرائی کی آلودگی ہوگی،

شباب کو بہانہ نہ بنائیے، خالق کو شباب میں یاد کیجئے کہ اعلیٰ صفات کی متوازن تحلیل سے کیرکٹر بنتا، پرورش پاتا اور استوار ہوتا ہی،

"ن ص"

اخبارِ علمیہ

ایک قدیم تاریخی کھیل

جس طرح شطرنج بادشاہوں کا قدیم دماغی کھیل رہا ہے، اسی طرح "گوے چوگان" یا پولو پسندیدہ [?] ورزشی کھیل رہا ہی، اس کا بہت قدیم زمانہ سے پتہ چلتا ہی اور قدیم تاریخوں اور شاعری دونوں میں اس کا ذکر موجود ہے، "ہمیں میداں ہمیں چوگاں ہمیں گوے" سے ہر شخص واقف ہی، اس کا غالباً سب سے قدیم ذکر سکندر مقدونی کے حالات میں آتا ہی، اس کے متعلق یہ حکایت مشہور ہی کہ دارا نے اس کے پاس گیند اور بلا بھیجا تھا، اس سے یہ اشارہ مقصود تھا کہ سکندر اپنے گھر کی چہار دیواری میں اس قسم کے کھیل تماشوں میں مشغول رہے، اور نظام دنیا سنبھالنے کا خیال چھوڑ دے، سکندر نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ "دنیا گیند ہوگی اور سکندر اس کا بلا ہوگا"، ایران کا مشہور بادشاہ اردشیر اس کھیل کا بڑا ماہر تھا، ایرانی داستانوں میں یہ افسانہ مشہور ہے کہ اس کو اس کھیل سے اتنی دلچسپی تھی کہ اُس نے اعلان کیا تھا کہ جو شخص گوے چوگان کا سب سے اچھا کھلاڑی ہوگا، اس کو وہ اپنا متبنیٰ بنا لے گا، اس اعلان پر ایک شخص نے اس کو اپنا کھیل دکھایا، اردشیر کو اتنا پسند آیا کہ اُس نے اس کو ولیعہد بنا لیا، یہ متبنیٰ ولیعہد شاپور تھا، فارسی شاعری میں غالباً سب سے پہلے رباعیات عمر خیام میں اس کا ذکر ہے، ایران میں عورتیں تک گوے چوگان کھیلتی تھیں، نظامی نے خسرو شیریں میں شیریں کے کھیل کا نہایت دلکش منظر دکھایا ہی، ہارون رشید کو بھی اس سے دلچسپی تھی، چنگیز خاں کا ایک لڑکا تولی گوے چوگان کا ماہر تھا، اور اُس نے اپنے

حاشیہ نشین بھی اس کھیل کے ماہر چنے تھے، تیمور لنگ کے متعلق مشہور ہے کہ اُس نے دمشق میں انسانی سروں کو گیند بنا کر کھیلا تھا، اصفہان میں اب تک میدان شاہ کے نام سے ایک میدان مشہور ہے، جس میں سولہویں صدی میں گوے چوگان ہوا کرتا تھا، اور شاہ عباس صفوی اپنے محل میں بیٹھ کر اس کا تماشہ دیکھا کرتا تھا، اور کبھی کبھی خود بھی کھیل میں شریک ہوتا تھا، چین و جاپان میں بھی یہ کھیل ایک مختلف شکل میں رائج تھا، ہندوستان میں اس کھیل کا مرکز منیپور (؟) شمار کیا جاتا تھا، اور یہاں کے باشندے سارے ہندوستان میں اس کے ماہر سمجھے جاتے تھے، کھیل کے میدان میں نہایت شاداب لان تھا اور چاروں طرف پتھر کی بلند فصیل تھی، یہاں کے باشندے اس کھیل کے ایسے شائق تھے کہ جب تک ان کے گھوڑے نہ تھک جاتے تھے، وہ نہ تھکتے تھے اور دن سے رات کی تاریکی تک کھیلتے رہتے تھے،

تحت البحر

آج کل تحت البحر یا ڈبکنی کشتی کو بڑی جنگی اہمیت حاصل ہی، گو یہ بھی ایک قسم کی کشتی ہی، لیکن اسکی ساخت اور شکل وصورت سطحِ سمندر پر چلنے والے جہازوں سے بالکل مختلف ہوتی ہی، چونکہ پانی کی سطح کا اس پر بڑا دباؤ پڑتا ہے، اسلئے وہ نہایت ٹھوس اور مضبوط دھات کی بنائی جاتی ہی، اور سگار کی طرح نیچے اوپر اس کے کئی پرت لپٹے ہوتے ہیں، غوطہ زنی کے وقت اس کے تمام منفذ جنھیں اصطلاح میں دہانہ یا کھڑکی کہا جاتا ہی، مضبوطی کے ساتھ بند کر دیئے جاتے ہیں، نئی طرز کی تحت البحر میں تین دہانے ہوتے ہیں، پانی کی سطح کے اوپر لاتے وقت آگے پیچھے کے دو دہانے بند کر دیے جاتے ہیں، اوپر لانے کے لئے صرف درمیانی دہانہ کھلا رہتا ہی، غوطہ لگاتے وقت کشتی کو بھاری کرنے کے لئے اسکی ٹنکی میں ۶۰۰ ٹن سمندر کا پانی بھرا جاتا ہی، جس کے بوجھ سے کشتی اندر بیٹھ جاتی ہے، نئی طرز کی تحت البحر صرف بجلی کے پنکھوں کے ذریعہ چلائی جاتی ہی، اس میں اتنی کثرت سے اور ایسے باریک آلات ہوتے ہیں

کہ ساری جگہ گھیر لیتے ہیں، اسلئے اس کا اندرونی حصہ بہت تنگ ہوتا ہے، کپتان کے چلنے پھرنے کے لئے صرف تنگ راستے ہوتے ہیں، تاہم اس کے سونے کھانے، پکانے اور نہانے وغیرہ کی جگہوں کا معقول انتظام ہوتا ہے، کپتان کیلئے سطح سمندر کے اوپر کی چیزوں کی نقل و حرکت کی نگرانی ضروری ہوتی ہے، ان کو دیکھنے کے لئے ایک خاص قسم کی دوربین ہوتی ہے، اسمیں اوپر نکلی ہوئی نلکی میں شیشہ لگے ہوتے ہیں، اس سے اوپر کے جہازوں کی نقل و حرکت صاف نظر آتی ہے، صرف کپتان دشمن کے جہازوں کا اندازہ کر سکتا ہے، اور جہاز رانوں کو تحت البحر کا رخ اُن کی طرف پھیرنے اور ان پر تارپیڈو مارنے کا حکم دیتا ہے، ہر تحت البحر میں عموماً اوسط درجے کے بارہ تارپیڈو ہوتے ہیں، اور ایک بڑی مار کی توپ ہوتی ہے، جب تحت البحر کو پانی کی سطح کے اوپر لانا مقصود ہوتا ہے، تو کپتان پانی نکالنے کا آلہ دبانے کا حکم دیتا ہے، پانی نکلنے کے بعد تحت البحر ہلکی ہو کر اوپر آجاتی ہے،

ہندوستان میں پٹرول کا کارخانہ

موٹر، ہوائی جہاز، ٹینک اور دوسرے جنگی آلات کے علاوہ اکثر مشینوں کا دار و مدار بڑی حد تک پٹرول کے اوپر ہے، اس لئے موجودہ جنگ میں پٹرول کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس وقت دنیا کے پٹرول کے بڑے بڑے مخزن جن سے ۲۷۰ ملین ٹن سالانہ پٹرول نکلتا ہے، اتحادیوں کے قبضہ میں ہیں ۱۶۶ ملین ٹن ممالک متحدہ امریکہ سے نکلتا ہے، ۴۰ ملین ٹن سوویٹ روس سے (اب سوویٹ کا مخزن سخت خطرہ میں پڑگیا ہے)، اس کے مقابلہ میں محوری طاقتوں کے قبضہ میں صرف رومانیا کا مخزن ہے، جس سے کل ۱۲ ملین ٹن سالانہ پٹرول نکلتا ہے، ہالینڈ نے جاوہ کے تمام مخزن برباد کر دئے، ہندوستان میں کچھ دنوں پہلے تک پٹرول کے کارخانوں کا کوئی نشان نہ تھا، اب آسام اور شمالی ہند کے بعض حصوں میں اس کے کنوئیں نکلے ہیں، جہاں پٹرول نکالنے کے کارخانے قائم کر دئیے گئے ہیں، ان میں سے پٹرول خام

صورت میں نکلتا ہے جسے پکا کر صاف کیا جاتا ہے، اس کے لئے بڑے بڑے مینار نما حوض ہوتے ہیں، ان میں نیچے اوپر کئی درجے ہوتے ہیں، خام پٹرول پکنے کے دوران میں ان تمام درجوں سے گذرتا ہوا، آخری درجہ کا صاف شدہ پٹرول سب سے بہتر ہوتا ہے، یہی ہوائی جہازوں میں استعمال ہوتا ہے، دوسرے درجہ کا موٹروں کے اور تیسرے درجہ کا روشنی کی گیس کے کام میں آتا ہے، ہندوستان میں سب سے اول ۱۹۱۵ء میں پٹرول کے کنوؤں کا اکتشاف ہوا، اور ۱۹۲۱ء میں اسکو نکالنے اور صاف کرنے کے لئے چھوٹا سا کارخانہ قائم کیا گیا، لیکن ۱۹۳۹ء سے اس کو بڑے پیمانہ پر وسیع کر دیا گیا ہے، اور اس کے لئے جدید قسم کے تمام سامان مہیا کئے گئے ہیں،

حبشہ میں اسلامی عدالتوں کا قیام

حبشہ میں قدیم زمانہ سے مسلمانوں کی بڑی تعداد آباد ہے، اور یہاں اُن کو ہر قسم کی مذہبی سہولتیں حاصل ہیں، ہیلا سلاسی بادشاہ حبش کی مسلمانوں پر بڑی نظر توجہ ہے، اور ان کے مذہبی امور سے خاص دلچسپی ہے، چنانچہ حال ہی میں اُنھوں نے مسلمانوں کی مذہبی عدالتوں کے قیام اور ان کے لئے قضاۃ کے تقرر کا حکم دیا ہے، مسلمانوں کے نکاح و طلاق، وراثت و وقف وغیرہ کے جملہ مذہبی مسائل ان عدالتوں کے سامنے پیش ہوا کریں گے، ابتدائی عدالت کے فیصلوں کی اپیل کے لئے عنقریب ایک عدالت العالیہ بھی قائم ہونے والی ہے،

لندن میں ایک نئی مسجد کی تعمیر

لندن میں ووکنگ کی مسجد عرصہ سے موجود ہے، اب مغربی لندن "وسٹ اینڈ" میں ایک بڑی اور وسیع مسجد اور اس سے متعلق ایک جلسہ گاہ اور کتبخانہ کی تعمیر کا مسئلہ زیر تجویز ہے اور اسکی ابتدائی کارروائی شروع ہو گئی ہے، حکومت نے مسجد کی تعمیر کیلئے ایک زمین جسکی قیمت ایک لاکھ گنی ہے، تعمیر کی کمیٹی کے حوالہ کر دی ہے، اصل عمارت کے مصارف کا تخمینہ کئی لاکھ گنی ہے، تمام اسلامی ممالک کو اس کار خیر میں حصہ لینے کی دعوت دیجائیگی، لندن کے مصری سفیر نشأت پاشا نے اس کام کو شروع کر دیا ہے،

"م"

ادبیات

جذبِ مجذوب

از جناب خواجہ عزیزالحسن صاحب مجذوب ؔ ، انسپکٹر مدارس،

یا نویدِ وصل تھی یا موت کا پیغام ہی
عشق کا آغاز کیا تھا اور کیا انجام ہی

اب کہاں وہ دن کہاں وہ ساقیِ گلفام ہے
اب بجائے دورِ ساغر گردشِ ایام ہی

خیر ہی پردہ نشیں کیوں آج قصدِ بام ہی؟
آج ارادے کیا ہیں کیا منظور قتلِ عام ہی؟

راہِ صحرا کی جا مجنوں ابھی تو خام ہے
عشق کے ہم بخیہ کاروں میں ترا کیا کام ہی

کیا ہی اوجِ عشق ہر سیڑھی مری اک بام ہی
وہ مرا آغاز ہے اوروں کا جو انجام ہی

دم یہاں اکھڑا ہوا ہی نزع کا ہنگام ہی
کیا کہی ہی لو خدا حافظ ہمیں اب کام ہی

اُس مقامِ عشق پر اب ہوں کہ اے بلبل جہاں
نالہ و فریاد اک آوازِ بے ہنگام ہی

دل فقط دیکر تو بس تکلیف ہی تکلیف تھی
جان بھی دیدی تو اب آرام ہی آرام ہی

ربط و بے ربطیِ حسن و عشق کیا کیجے بیاں
بام بے زینہ ہی وہ یہ زینۂ بے بام ہی

میں تو ہوں ہی رندِ زاہد پارسا تو بھی نہیں
میں اگر ہوں جام بر کف تو نظر بر جام ہی

دم رکا سمجھو، اگر دم بھر بھی یہ ساغر رکا
میرا دورِ زندگی ہی یہ جو دورِ جام ہی

ہیں حرام اس مسلکِ رندی میں ایسی مستیاں
ہوش میں آ ہم تو سے پیغمبر ہی کو ابلیم ہی

جذب میں مجذوب مستانہ ہی آ کوٹھے پہ آ
قابلِ دید اک تماشا آج زیرِ بام ہی

ہو گئیں مفقود کیا دنیا سے آنکھیں لے خدا
پوچھتے پھرتے ہیں سب مجذوب کسکا نام ہی

یہ معانی یہ حقائق یہ روانی یہ اثر
شاعری تیری ہی اے مجذوب یا الہام ہی

فیضِ عشق

از جناب اسد ملتانی

عشق کے فیض سے موجود ہیں دیوانے چند
دیکھ لو آج بھی آباد ہیں ویرانے چند

یہ نہ سمجھو کہ کوئی بندۂ محرم نہ رہا
نظر آتے ہیں اگر بزم میں بیگانے چند

دامِ اُلفت میں خردمند بھی پھنس جاتے ہیں
مرغِ دانا کیلئے بھی ہیں یہاں دانے چند

آگیا حضرتِ واعظ کی زباں میں بھی اثر
یاد تھے اہلِ محبت کے جو افسانے چند

کم سے کم شہر کے مستوں میں تو ہمرنگی ہو
ایک سی مے جو پلائیں یہی میخانے چند

ہوں میں اُن شوخ نگاہوں کے فسوں کا قائل
جن سے مائل بہ جنوں ہو گئے فرزانے چند

حسن اور عشق میں ہے ربط بدستور اسد
شمع جلتی ہے تو آجاتے ہیں پروانے چند

رُباعی

از جناب سید احمد حسین صاحب امجد حیدر آبادی

دن رات کے ہمدم کو سمجھتے ہوتے
دم بھر دمِ آدم کو سمجھتے ہوتے

یہ سچ ہے کہ "ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں"
اے کاش کہ ہم، ہم کو سمجھتے ہوتے

محمد (صلعم) مولفہ توفیق الحکیم تقطیع چھوٹی ضخامت ۳۵۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت معلوم نہیں پتہ ہند پریس ساگردت لین کلکتہ،

مصر کے ایک اہلِ قلم توفیق الحکیم نے عربی میں تمثیل کے پیرایہ میں سیرت نبوی لکھی ہی، مولانا عبد الرزاق صاحب ملیح آبادی نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا ہی، جہاں تک واقعات کی صحت اور اُن کی افادی حیثیت کا تعلق ہے، قریب قریب کل واقعات مستند اور سبق آموز ہیں، لیکن نفس تمثیل نبوت کی عظمت اور اسکے تقدس کے منافی ہے مثلاً ایک مسلمان کو بغیر کسی تعظیمی لفظ کے ہر سطر میں تنہا "محمد" میں سوے ادب نظر آتا ہی بعض مقامات پر ترجمہ میں بھی یہ فروگذاشت ہو گئی ہے اور اردو کے بعض پُرانے مصنفین سیرت کی طرح زبان کے مقابلہ میں احترام کے پہلو کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہی، مثلاً "محمد ابو طالب کے گھمنڈ پر کودا کرتے تھے" (صفحہ) "محمد کو ہماری دیوار تک رگید لائے" (صفحہ) گو یہ الفاظ کفار کی زبان سے ہیں لیکن ایسے سخیف ہیں کہ ایک سنجیدہ قلم سے کسی معمولی انسان کے لئے بھی ان کا استعمال زیبا نہیں ہے، نہ کہ خدا کے پیغمبر برحق کے لئے، اس مفہوم کو دوسرے الفاظ میں بھی ادا کیا جا سکتا تھا، یا آنحضرت صلعم، حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عائشہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لئے بکثرت "چلانے" کا لفظ استعمال کیا گیا ہی، اس کے بجائے آسانی کے ساتھ "بلند آواز سے" کہا جا سکتا تھا، اس ظاہری فروگذاشت کے علاوہ معنوی اعتبار سے بھی بعض انتہائی ضعیف روایتیں درج ہو گئی ہیں، خصوصاً حضرت عائشہ صدیقہ رضی کی سیرت کا کوئی اچھا نمونہ نہیں پیش کیا گیا ہے، سوکنوں اور سوتیلی اولاد کے ساتھ اُن کا طرزِ عمل نہ صرف ام المومنین

کی شان بلکہ احترامِ نبوت کے بھی خلاف ہے، مثلاً حضرت جویریہ رضی کے بارہ میں آنحضرت صلعم سے ان کی تلخ گفتگو، حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش پر اُن کا رشک وحسد، آنحضرت صلعم کے ابراہیم کو حضرت عائشہ کے پاس لانے پر آپ سے ان کی بے رُخی اور نامناسب گفتگو، ابراہیم کی موت پر ان کی مسرت نہ صرف ام المومنین کی شان اور احترامِ نبویؐ کے خلاف ہے، بلکہ روایتی حیثیت سے بھی یہ واقعات حد درجہ ضعیف ہیں، ممکن ہی سیرت کی کسی کتاب میں مل جائیں، لیکن مولانا کو سیرت کی روایات کا پایہ معلوم ہوگا، ایسی حالت میں اُنھوں نے بغیر کسی تنقید کے اُنھیں کیسے قبول کر لیا، یہ صحیح ہے کہ اس کی ذمہ داری اصل مصنف پر ہی لیکن کم از کم حاشیہ میں ایسی روایتوں کی حیثیت ظاہر کر دینا چاہئے تھا، پھر ایسے واقعات کا جن سے کوئی مفید سبق نہیں ملتا، بلکہ اُلٹا اثر پڑتا ہے، ترجمہ کرنا کیا ضروری تھا، اپنے بعض ترجموں کی طرح وہ اُنھیں آسانی کے ساتھ حذف کر سکتے تھے، اس قسم کی فروگذاشتیں اور بھی ہیں لیکن سب کا استقصا مقصود نہیں، بعض مقامات پر ترجمہ کی بھی فروگذاشت نظر آئی، مثلاً حضرت ابراہیم کی وفات پر آنحضرت صلعم کے اس ارشاد "انا بک یا ابراھیم لمحزونون" کا ترجمہ کیا گیا ہی، ابراہیم ہم تیرے غم میں سوگوار ہیں، حالانکہ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ہم تیری وجہ سے یا تیرے لئے غمگین ہیں، "سوگواری" نبوت کی شان سے بعید ہی، ان فروگذاشتوں سے قطع نظر کتاب مختلف حیثیتوں سے مفید ہی، گو اس کا طرز ہمارے نزدیک پسندیدہ نہیں ہی لیکن عام لوگ اسے دلچسپی سے پڑھیں گے، اور سیرت نبوی کی اشاعت کا اس سے پورا فائدہ حاصل ہوگا،

جواہر العلوم، مترجمہ مولانا عبد الرحیم صاحب مولوی فاضل تقطیع بڑی ضخامت ۲۱۹ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عـ۸ر پتہ، کتابستان پوسٹ بکس ۳۱۶۴ بمبئی عـ۳

اللہ تعالیٰ نے کلام مجید میں اپنے وجود اپنی توحید اور اپنی قدرت و حکمت کے ثبوت میں کائنات عالم سے بکثرت شواہد پیش کئے ہیں، اور مختلف النوع حیوانات، بوقلموں نباتات، متواج سمندروں،

فلک بوس پہاڑوں، ابر و باراں، سیاروں کے نظام، آفتاب و ماہتاب کی گردش اور اس قبیل کی دوسری ارضی و سماوی کائنات پر عبرت و بصیرت کے لئے غور و فکر کا حکم دیا ہے، ہر دور کے علماء نے اپنے زمانہ کے علم و نظر کے مطابق ان کے عجائبات کے اسرار و حکم اور اس کے فوائد و مصالح بیان کئے ہیں، موجودہ دور کے اکتشافات اور فلسفہ و سائنس کی ترقی نے اپنی تحقیقات سے پہلے زمانہ سے زیادہ خدا کی قدرت و عظمت اور اسکی حکمتوں کا ثبوت فراہم کر دیا ہے، چنانچہ اس زمانہ کے ایک مشہور مصری عالم طنطاوی جوہری نے جو جدید علوم کے بھی فاضل ہیں، ان اکتشافات کی روشنی میں کلام مجید کے ان ایات کی ایک مستقل تفسیر لکھی ہے، تفسیر کے علاوہ انھوں نے اس موضوع پر مکالمہ اور گفتگو کے دلپذیر انداز میں ایک مستقل کتاب جواہر العلوم کے نام سے لکھی ہے، مولانا عبد الرحیم صاحب نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا ہے، اس میں قدیم علوم اور جدید اکتشافات کی روشنی میں کلام مجید کے پیش کردہ عجائبات عالم کے اسرار و حکم اور فوائد و مصالح بیان کئے ہیں، ترجمہ سلیس ہے، اور نئی تعلیم یافتہ جماعت خصوصاً نوجوان طالب علموں کے پڑھنے کے لائق ہے،

گنجہائے گرانمایہ از پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۱۵ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، پتہ اردو بک ایجنسی علی گڈھ،

گنجہائے گرانمایہ پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے اپنے بعض مخلص احباب اور قابل احترام اکابر کی وفات پر لکھے تھے، مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، مولانا سلیمان اشرف صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی، مولانا ابوبکر محمد شیث جونپوری ناظم دینیات، اصغر گونڈوی، مرز کے مخلص دوست ایوب عباسی مرحوم، سر اقبال، مشہور شاعر مولوی احسن مارہروی مرحوم، ان میں ایوب عباسی مرحوم کے علاوہ قریب قریب سب متعارف اشخاص ہیں، اس سے پہلے رشید صاحب کے مضامین کے دو قابل قدر مجموعے نکل چکے ہیں، لیکن گنجہائے گرانمایہ کی نوعیت ان سے بالکل جدا ہے،

پہلے مجموعوں کے مضامین ان کے دماغ کا نتیجہ ہیں اور یہ دلی محبت و احترام کا، اسلئے ان سے دماغی تفریح ہوتی ہے، اور ان سے دل متاثر ہوتا ہے، لکھنے والے کا دلی تاثر مضامین کی سطر سطر سے نمایاں ہے جس سے پڑھنے والا بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، جس سے جس نوعیت کا تعلق ہے، اسی نوعیت کا تحریر میں اثر ہے، مرنے والوں کی خصوصیات اور سیرت کا ایسا جاندار نقشہ کھینچا گیا ہے کہ ان کا مجسم وجود نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے، اور اس آئینہ میں خود مصنف کی سیرت، اسکے اخلاقی معیار، اور مختلف خیالات و رجحانات کا عکس نظر آتا ہے، یہ مضامین ادبی حیثیت سے بھی بلند پایہ ہیں، اس کے بہت سے فقرے تخیل اور طرز ادا کے اعتبار سے ادبی اور اخلاقی مقولوں کا درجہ رکھتے ہیں، اس مجموعے سے مصنف "خنداں" کے قلم کا ایک نیا پر تاثیر رخ سامنے آتا ہے،

نشریات:- از پروفیسر ہارون خاں شروانی صدر شعبۂ تاریخ و سیاسیات جامعہ عثمانیہ، تقطیع بڑی، ضخامت ۱۰۵ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ کلدار، عار حالی، پتہ سید عبد القادر اینڈ سنس چار مینار و سید عبد الرزاق تاجر کتب مصطفی بازار حیدرآباد دکن،

یہ کتاب پروفیسر ہارون خاں شروانی کی اٹھارہ ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے، تاریخی، فلبیں، ایڈریانوپل، چین کا تمدن، قدیم ہندوستانی تمدن، زلزلہ اناطولیہ، عید میلاد، بین اقوامی سیاسیات، روزہ، ڈنمارک، ترکی، عربوں کا تمدن، عمومیت کا مستقبل، قومیت، عالمی وفاق کا مسئلہ، سیاسیات اور اردو زبان، چین، ہندوستان کے موجودہ مسائل، ان سب تقریروں میں اختصار کے باوجود موضوع سے متعلق تمام ضروری معلومات موجود ہیں، انداز بیان دلچسپ ہے، مذہبی تقریریں مقرر کے دینی جذبہ کی آئینہ دار ہیں، موجودہ حالات کے لحاظ سے سیاسیات کی تقریریں خاص طور سے زیادہ مفید اور پڑھنے کے لائق ہیں، ایک مقام پر غالباً سہواً ابن رشد کو عجمی علماء کے زمرہ میں شمار کیا گیا ہے، حالانکہ وہ عربی النسل ہے،

ذکر حسین:- از جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۳۲ صفحے، کاغذ کتابت

وطباعت بہتر قیمت ۳ ر پتہ :۔ خان الیاس احمد مجیبی جامعہ نگر، دہلی،

گذشتہ یادگار حسینی کے موقع پر ایک بیچے ذاکر حسین نے یہ تقریر کی تھی اس موقع پر ہندوستان میں سیکڑوں پُرجوش تقریریں ہوئیں، لیکن یہ تقریر ان سب سے مختلف ہی، اس میں نہ جذبات کا طوفان ہی نہ شاعرانہ طرز بیان زلف کا طلسم بلکہ سادہ زبان میں چند حقیقتیں بیان کی گئی ہیں اور قوت وجبروت اور ظلم وطغیان کے مقابلہ میں احیاے حق کیلئے قربانی اور شہادت کی عظمت کی روشنی میں واقعہ شہادت کو نہایت موثر دلنشین اور فلسفیانہ انداز میں پیش کیا گیا اور ناکامی کی حکمت وعظمت اور حکم، حکمت اور حق کی وحدت کو بڑی خوبی سے دکھایا گیا ہی، گو یہ تقریر مختصر ہے لیکن معنویت کے اعتبار سے بڑی بڑی تقریروں سے زیادہ مفید اور سادگی کے باوجود زبان میں پوری شیرینی موجود ہی،

ہماری زبان :۔ سر تیج بہادر سپرو، تقطیع چھوٹی ضخامت ۵۹ صفحے کاغذ وکتابت وطباعت بہتر، قیمت ۸ ر پتہ انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی۔

ڈاکٹر سپرو کو اردو زبان سے جو انس ومحبت ہی، اس کا اظہار اُنکی زبان وقلم سے برابر ہوتا رہتا ہی، اُنھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں اردو کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہیں، ان کو انجمن ترقی اردو نے ہماری زبان کے نام سے ایک جگہ جمع کر دیا ہی، یہ تقریریں تنہا خیالات کا مجموعہ نہیں بلکہ اُردو کی حمایت کے ساتھ اسکے دلائل بھی ہیں،

گرام سدھار :۔ از جناب عبدالشکور صاحب ایم اے بی ٹی علیگ بریلی کالج، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۹ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۸ ر پتہ منیجر اسلامیہ گرلس ہائی اسکول، بریلی،

ہندوستان کی آبادی کا سب سے اہم عنصر کسان ہیں، لیکن بدقسمتی سے سب سے زیادہ ابتر حالت اسی طبقہ کی ہی، اب حکومت نے برائے نام اسکی اصلاح کی طرف توجہ کی ہے، کانگرسی حکومت کے زمانہ سے گرام سدھار شروع ہو گیا ہی، مؤلف نے اس کتاب میں اسی گرام سدھار کا نقشہ پیش کیا ہی، اور کسانوں کی بستی اُن کی زبون حالی اس کے وجوہ واسباب اور اُنکی مجبوری کو دکھلا کر اسکی اصلاح وترقی کی تدبیریں بتائی ہیں، جن لوگوں کو گرام سدھار سے دلچسپی ہی، ان کو اس کتاب میں بہت سی مفید باتیں ملیں گی،

"م"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دولت آصفیہ کے جدید عربی مطبوعات

مطبوعہ

دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن

۱ - تاریخ کبیر للامام البخاری

شیخ الاسلام حافظ جلیل محمد بن اسمعیل البخاری المتوفی ۲۵۶ھ کی رجال حدیث مین سب سے قدیم اور مستند کتاب ھے - اس جلیل القدر کتاب کا اشتیاق ارباب علم کو صدیون سے تھا الحمدللہ اس نایاب کتاب کے نسخے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد، کتب خانہ آستانہ اسلامبول، اور کتب خانہ خدیویہ مصر، سے دستیاب ھوئے جس کے بعد تصحیح عمل مین آئی اور جلد رابع طباعت مین مقدم رکھی گئی

		صفحات	قیمت عثمانیہ روپیہ	آنہ	کلدار روپیہ	آنہ
جلد	٤ قسم (۱)	٤٦٨	۳		۸	۳
«	٤ (۲)	٤٦٨	٤		۱۰	٤

۲ - کتاب الکنی للامام البخاری

امام مسلم رحمہ اللہ کی کتاب الکنی کی طرح یہ بھی ایک علحدہ کتاب ھے جس مین صرف کنیتون کا ذکر ھے

صفحات (۱۰۰) قیمت عثمانیہ (۱۵) آنہ کلدار (۱۳) آنہ

۳ - کتاب الامالی للامام محمد

یہ امام محمد رحمہ اللہ کے امالی ھین جو نصوص فقہیہ کا درجہ رکھتے ھین اس مجموعہ کی بڑی خصوصیت یہ ھے کہ فقہ کے اھم مسائل کو نہایت سلیس طریقہ بیان سے طلبہ کی آسانی کیلئے تحریر فرمایا ھے یہ حصہ مسائل دین سے مسائل طلاق تک مشتمل ھے

صفحات (۸۱) قیمت عثمانیہ (۱٤) آنہ کلدار (۱۲) آنہ

۴ - کتاب الجرح والتعدیل

امام حافظ ابو محمد عبد الرحمن بن ابی حاتم الرازی المتوفی ۳۲۷ ھ کی تصنیف ھے - اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ھے کہ رواۃ کے احوال کو قطعیت کے ساتھ ظاھر کیا گیا ھے

یہ کتاب چار جلدون پر مشتمل ھے ابتک تیسری جلد طبع ھو سکی ھے

	صفحات	قیمت عثمانیہ روپیہ	آنہ	کلدار روپیہ	آنہ
جلد ۳ قسم اول	۴۳۲	۳	۸	«	۳
« دوم	۳۲۸	۳	۲	«	۲	۱۱

۵ - میزان الحکمة

علامہ عبد الرحمن الخازنی المتوفی (۵۱۵) ھ کی اھم ترین تصنیف ھے جس مین سونے چاندی اور فلزات کے تولنے اور پرکھنے کے اصول سے بحث ھے

اس کتاب پر پروفیسر عبد الرحمن خان صاحب سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ نے بلحاظ تحقیقات جدیدہ ایک تبصرہ بھی لکھا ھے

صفحات (۳۱۶) قیمت عثمانیہ (۳) روپیہ کلدار (۲) روپیہ ۱۰ آنہ -

۶ - انباط المیاہ الخفیہ

علامہ حاسب کرخی متوفی ۴۰۸ھ کی تصنیف ھے جس مین زمین مین سوتون اور چشمون کے پتہ چلانے اور نہر اور کنوون کے کھودنے پر محققانہ بحث ھے

صفحات (۹۲) قیمت عثمانیہ (۱۴) آنہ. کلدار (۱۲) آنہ

۷ - کتاب الافعال

علامہ ابو القاسم علی بن جعفر المعروف با بن القطاع کی لغت مین ایک اھم اور مبسوط تصنیف ھے جس مین کتاب الافعال لابن القوطیہ پر اضافہ کیا گیا ھے

	صفحات	قیمت عثمانیہ روپیہ	آنہ	کلدار	روپیہ	آنہ
جلد اول	۳۹۸	۳		«	۲	۱۰
جلد دوم	۴۹۲	۴	۹	«	۳	۱۵

خادم العلم

ناظم و مددگار معتمد دائرۃ المعارف جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن

"جلد ۵۰" ماہ شعبان ۱۳۶۱ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۴۲ء "عدد ۳"

مضامین